عرفان صدیقی شخص اور شاعر
(جدید اشاعت مع ترمیم و اضافہ)
مرزا شفیق حسین شفق

عرفان صدیقی: شخص اور شاعر

(جدید اشاعت مع ترمیم و اضافہ)

عرفان صدیقی: شخص اور شاعر

(جدید اشاعت مع ترمیم واضافہ)

مرزا شفیق حسین شفق

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

IRFAN SIDDIQI-SHAKHS AUR SHAIR

By

Dr. MIRZA SHAFIQ HUSAIN "SHAFAQ"

Year of Ist Edition 2008
Year of IInd Edition 2011
Year of IIIrd Edition 2012
ISBN 978-81-8223-427-7
Price Rs. 200/-

کتاب : عرفان صدیقی: شخص اور شاعر
مصنف و ناشر: ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق
اشاعت اول : ۲۰۰۸ء
اشاعت دوم : ۲۰۱۱ء
اشاعت سوم : ۲۰۱۲ء
تعداد : ۱۱۰۰
قیمت : ۲۰۰ روپے
طباعت : عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔۶

دستیاب:

- ادارۂ لوح و قلم، قصبہ سانکھنی، ضلع بلند شہر۔ (یوپی)
- خیبر شکن اکادمی، ۵۔ یونٹی اپارٹمنٹ، ۵۵ رجگت نرائن روڈ، لکھنؤ۔۱۸

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

استاد محترم

پروفیسر انیس اشفاق

کے

نام

مرزا شفیق حسین شفق

تعارف

نام: مرزا شفیق حسین

قلمی نام: مرزا شفیق حسین شفق

والد: جناب مرزا نبی حسن

برادر: ڈاکٹر مرزا اخی حسن

تاریخ پیدائش: یکم مارچ ۱۹۸۱ء

جائے پیدائش: قصبہ سانکھنی، ضلع بلند شہر (یو. پی.)

ابتدائی تعلیم: اسلامیہ پرائمری مکتب، قصبہ سانکھنی، ضلع بلند شہر

اعلیٰ تعلیم: جامعہ سلطانیہ لکھنؤ، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

پیشہ: درس و تدریس۔ لکچرر حسین آباد گورنمنٹ کالج لکھنؤ

ادبی مشاغل: تنقید و تحقیق

تصانیف و تالیفات:
خراج حیات (انتخاب مضامین)
زندہ آوازیں (انتخاب تقاریر)
عرفان المجالس (انتخاب تقاریر)
تجلّیٔ نور (رثائی شاعری)
ارتباط نبوت و امامت (مجموعۂ تقاریر)
صیرفیٔ ادب (تنقیدی مضامین)
مراثی فارغ (رثائی شاعری)
ترقی پسند افسانہ: انگارے سے عصر حاضر تک (تحقیقی مقالہ)

رہائش: ۵ / ریونٹی اپارٹمنٹ، ۵۵۔ جگت نرائن روڈ لکھنؤ۔ ۱۸

موبائل: 9452292302

E-mail:shafiqhusain@rediffmail.com

فہرست

چوتھا باب

پانچواں باب

پیش لفظ

پروفیسر انیس اشفاق
صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

عرفان صدیقی نئی اردو غزل کا وہ نمایاں نام ہے جس نے راہ سے بھٹک جانے والی اردو غزل کو نہ صرف اس کے اصل جادے سے روشناس کرایا بلکہ اپنی تخلیقی ذکاوت کے ذریعے غزل کے اصل لوازم کے ساتھ اس کی نئی صورت گری کی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ خود کو دہراتے رہنے کے عمل میں بڑے شاعروں کے ایک مقام پر ٹھہر جانے والے زمانے میں تخئیل کی تازہ کاری اور اسلوب کی شادابی کے ساتھ چار اہم مجموعوں پر مشتمل افق شاعری پر نمودار ہونے والے غزلنامۂ عرفان نے غزل کے موضوعات و مضامین کا ایک نیا منظر نامہ ترتیب دیا اور غزل کے بعض موضوعات کی تجدید اور بعض مضامین کی تہذیب نو کے ذریعے غزل کو معنی اور لہجے کی سطح پر ایک نیا قالب عطا کیا۔ عرفان کی شاعری میں کربلا کے نئے معنوی جہات جس طرح نمایاں ہوئے ہیں اور جس طرح عشق کے نئے رنگ ان کی شاعری میں روشن ہوئے ہیں وہ اس طور کہیں اور نظر نہیں آتے۔ کمال تو یہ ہے کہ شاعری میں یہ کمال عرفان نے بہت جلد کر دکھایا۔ جو شاعر عرفان کی شاعری کے مقبول ہونے سے قبل اپنی شاعرانہ حیثیت منوا چکے تھے، عرفان ان سے بہت آگے نکل گئے۔ لیکن عرفان کی شاعری کے بہت جلد مقبول ہو جانے اور اپنے زمانے کے بڑے شاعروں میں شاعرانہ سبقت حاصل کر لینے کے باوجود اس ادبی المیے کو فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اردو کے بڑے نقادوں

نے نہ تو عرفان کی زندگی میں ان پر کچھ لکھنے کی زحمت گوارا کی اور نہ ان کے اٹھ جانے کے بعد ان کی شاعری پر قلم اٹھایا۔ یہ ادبی المیہ ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا کرتا ہے کہ وہ شاعر جس نے غزل کو اپنی تخلیقی بصیرتوں کے ذریعے نئے رنگ و آہنگ سے متعارف کرایا ہو، جس کی شاعری کی ہر نئی قرأت تحسین شعر کا ایک نیا دروازہ کھولتی ہو اور آخر عمر میں جس کی غزل فن کے درجۂ کمال تک پہنچ گئی ہو اس کی قدر شناسی کی سعی ہمارے نقادوں نے کیوں نہیں کی۔ یہ بات میں نے عرفان صدیقی سے متعلق اپنی تحریروں میں بھی کہی ہے اور علمی اور ادبی مجلسوں میں بھی بار بار اس کا ذکر کیا ہے۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ جو کام ادب کے بڑے نقادوں سے نہ ہو سکا اسے ادب کے ایک نوجوان اور ہونہار طالبعلم نے بہ تمام و کمال نہ سہی لیکن بہ حسن و خوبی کر دکھایا اور عرفان صدیقی پر قلم اٹھا کر اس ادبی قرض کو بڑی حد تک اتار دیا جو ناقدان شعر و ادب پر واجب تھا۔ مرزا شفیق حسین شفق میری نگاہ میں اس وقت آئے جب وہ ایم.اے. کے طالبعلم کی حیثیت سے میرے شعبے میں داخل ہوئے اور شعبے کی ادبی نشستوں میں مجھ پر یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ مرزا شفیق نہ صرف عرفان صدیقی کی شاعری کے زبردست شیدائی ہیں بلکہ ایک مستقل سامع کی حیثیت سے عرفان کی شاعری انہیں کی زبانی سنتے رہتے ہیں اور ان کے گہرپاروں کو خوبی کے ساتھ چنتے رہتے ہیں۔ عرفان صدیقی کی شاعری میں ان کی یہ دلچسپی دیکھ کر میں نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ ایم.اے. کے مختصر مقالے کے لئے عرفان صدیقی کا انتخاب کریں۔ مرزا شفیق نے خوش دلی کے ساتھ میرا یہ مشورہ قبول کیا اور بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ عرفان صدیقی کی شخصیت اور فن پر پانچ ابواب کو محیط ایک ایسا مقالہ رقم کیا جسے بلاشبہ عرفان شناسی کی راہ میں پہلا قدم قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس مقالے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عرفان صدیقی کے ان شخصی اور سوانحی گوشوں کا تفصیل سے احاطہ کیا گیا ہے جو عرفان کے مداحوں کی نگاہوں سے اب تک مخفی رہے ہیں۔ عرفان کی شخصیت اور سوانح سے متعلق یہ معلومات مرزا شفیق نے براہ راست شاعر سے حاصل کئے ہیں، اس لئے ان کے اعتبار و استناد میں کسی طرح کے شک کی کوئی

گنجائش نہیں رہتی۔ ان معلومات سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ عرفان کی تخلیقی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کس نوع کے عوامل کارفرما رہے ہیں نیز ان عوامل نے عرفان کی شاعری کا جامہ تیار کرنے میں کیا کردار ادا کیا ہے۔

مرزا شفیق ابھی نوجوان ہیں اور ادب کے میدان میں ان کی حیثیت ایک نو وارد کی سی ہے لیکن اپنی مختصر ادبی عمر کی روشن ہوتی ہوئی فہم کی روشنی میں انہوں نے عرفان صدیقی پر جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف اردو کی شعری تنقید کے لئے لائق توجہ ہے بلکہ عرفان کے ذی فہم قارئین کیلئے لائق تحسین بھی ہے۔ اس مقالے میں امکانات سے بھری ہوئی عرفان صدیقی کی شاعری کے نمایاں پہلوؤں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی شاعری کے نمایاں ترین پہلو یعنی علامات کربلا کی معنویت کا تفصیلی محاکمہ کیا گیا ہے تاہم مقالہ کی حد بندی کی بنا پر عرفان کی شاعری کے بہت سے پہلو اس مقالے میں آنے سے رہ گئے ہیں۔ لیکن مرزا شفیق حسین کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ عرفان شناسی کی راہ میں ان کی اس پہل سے ان لکھنے والوں کو ضرور تحریک ملے گی جو عرفان کی شاعری کے مداح و معترف تو ہیں لیکن جنہوں نے عرفان صدیقی پر لکھنے کا حق ابھی تک ادا نہیں کیا ہے۔ یہی اس مقالے کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

●●●

ابتدائیہ

پچاس اور ستر کی دہائی کے دوران اردو ادب کے شعری افق پر جو شعراء نمودار ہوئے ان میں ایک اہم نام عرفان صدیقی کا بھی ہے۔ عرفان صدیقی کا پہلا شعری مجموعہ ''کینوس'' اس وقت منظر عام پر آیا جب نئی شاعری پوری طرح اپنے قدم جما چکی تھی اور بعض نئے شاعر اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ ایسے حالات میں کینوس کا منصۂ شہود پر آنا اور عرفان صدیقی کا کینوس کے خالق کے روپ میں ہمارے ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی شاعری میں اسلوب کی ایسی تازہ کاری اور معنی کی ایسی ندرت موجود تھی جو نئی شاعری کے مستحکم نظام میں بھی اپنی الگ شناخت قائم کر رہی تھی اسی انوکھے اسلوب اور طرز احساس نے عرفان صدیقی کو ایک اہم شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقوں سے متعارف کرایا۔ ''کینوس'' کے بعد ''شب درمیاں'' اور ''شب درمیاں'' کے بعد ''سات سماوات'' اور ''سات سماوات'' کے بعد ''ہوائے دشت ماریہ'' اور ''ہوائے دشت ماریہ'' کے بعد ''عشق نامہ'' تک آتے آتے ان کی شعری حیثیت کو اعتبار حاصل ہوتا گیا اور ان کا شمار صف اول کے شاعروں میں کیا جانے لگا مگر آج تک عرفان صدیقی کی شاعری کا تفصیلی اور بامعنی محاکمہ نہیں کیا گیا ہے۔ ان کے ہم عہد اور قریب العہد معاصرین پر تو بہت کچھ لکھا گیا لیکن عرفان صدیقی پر ہمارے نقادوں نے ابھی تک کھل کر نہیں لکھا۔ قابل لحاظ اور لائق تحسین شاعری کی تخلیق کے باوجود ابھی تک عرفان صدیقی اپنی شاعری کی اصل اور دیانتدارانہ تعبیر و تفہیم کے منتظر ہیں۔ نقادوں کی اس عدم توجہ نے میرے دل میں یہ خیال

پیدا کیا کہ اپنے عہد کے اس ممتاز اور منفرد شاعر کے کلام کا حتی الوسع مطالعہ کیا جائے اور اس کی شاعری کے مختلف جہات ونکات کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی کے ماتحت میں نے اپنے ایم.اے.(۲۰۰۲ء) کے مقالہ (Dissertation) کے لئے عرفانؔ صدیقی کا انتخاب کیا تا کہ قارئین کے سامنے عرفانؔ صدیقی کی شاعری کا غیر جانبدارانہ مطالعہ پیش کیا جائے اور اس کے خطوط ورموز کو واضح کرنے کی کوشش کی جائے لیکن استاد محترم پروفیسر انیس اشفاق صاحب میری حوصلہ افزائی نہ فرماتے تو میرا خیال، خیال ہی رہتا اور اس مقالہ کی شکل میں عملی صورت اختیار کر کے آپ کے سامنے نہ آپاتا۔

زیر نظر مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلا باب عرفانؔ صدیقی کی سوانح اور شخصیت سے متعلق ہے کیونکہ شاعر کی اصل شخصیت کو پہچانے بغیر ہم اسے اور اس کے اسلوب کو نہیں سمجھ سکتے۔ دوسرے باب میں نئی شاعری پر اجمالاً گفتگو کرتے ہوئے غزل کے نئے افکار واقدار اور غزل کے نئے موضوعات واسالیب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب میں عرفانؔ صدیقی اور نئی غزل کے حوالے سے عرفانؔ صدیقی کے ابتدائی اسلوب، ان کے امتیازی لہجے اور انفرادی اسلوب نیز عرفانؔ صدیقی کی مخصوص لفظیات وعلامات وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ چوتھا باب عرفان صدیقی اور علامات کربلا سے مخصوص ہے۔ اس باب میں واقعۂ کربلا کی اہمیت ومعنویت، واقعۂ کربلا کے معنوی اقدار، واقعۂ کربلا کی علامتی قوت اور عرفان صدیقی کی شاعری میں علامات کربلا کی مخصوص اور معاصر معنویت پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ پانچویں باب میں عرفانؔ صدیقی کی شاعری کا مجموعی محاکمہ اور معاصر اردو شاعری میں اس کی اہمیت ومعنویت بیان کی گئی ہے۔

اس مقام پر اگر میں اپنے ان مشفق کرم فرماؤں اور مخلص احباب کا شکریہ ادا نہ کروں تو ناسپاسی ہوگی جنھوں نے اس مقالہ کو لکھتے وقت میری معاونت فرمائی خصوصاً استاد محترم پروفیسر انیس اشفاق صاحب (صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ) جنھوں نے اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود مجھے اپنا قیمتی وقت دیا اور قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے ذخیرے سے کتابیں، شعری مجموعے، رسائل اور اپنے مطبوعہ وغیر مطبوعہ

مضامین بھی مطالعے کے لئے عنایت فرمائے ہر چند کہ ان کے لطف وعنایات کا بدل شکریہ کا سا حقیر لفظ نہیں۔ پروفیسر نیر مسعود صاحب اور محترمہ سیدہ عرفان صاحبہ کا بھی مشکور وممنون ہوں کہ جن کے مفید مشورے میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوئے۔ اپنے ہمدرس احباب انجم یادو، غلام حسنین فاروقی اور قمر نقوی کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ جنہوں نے مجھے عرفان صدیقی اور ان کے معاصرین کے شعری مجموعے اور میرے مقالے کے عنوانات سے متعلق دیگر موضوعات پر کتب ورسائل فراہم کرکے مقالے کو منزل تکمیل تک پہنچانے میں میری مدد فرمائی۔

پیش نظر مقالے کو کتابی شکل میں لاتے وقت راقم السطور نے صرف اس حصے میں معمولی سی ترمیم کی ہے جو عرفان صدیقی کی سوانح سے متعلق ہے۔ یہ مقالہ عرفان صدیقی کے فن وشخصیت کی تفہیم کا حرف آغاز ہے حرف آخر نہیں کیونکہ تنقید وتحقیق ایک ایسا وسیع سمندر ہے جس میں روز بروز نقد ونظر کے نئے نئے دریاؤں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے لہٰذا غواصانِ ادب جتنا عرفان صدیقی کے فن کی گہرائی میں اتریں گے اتنے ہی نئے نئے نکات سامنے آتے جائیں گے۔ راقم السطور کی خواہش تھی کہ یہ مقالہ عرفان صدیقی کی زندگی ہی میں شائع ہوجاتا مگر بہ وجوہ ایسا نہیں ہوسکا نیز عرفان صدیقی کی زندگی نے بھی وفا نہیں کی اور شعر وسخن کا یہ آفتاب ۱۵/اپریل ۲۰۰۴ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔

مرزا شفیق حسین شفق
لکھنؤ

۹/جون ۲۰۰۸ء

●●●

ابتدائیہ

II

میں ان سخن فہموں اور عرفان شناسوں کا شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میری کتاب کی توقع سے زیادہ تحسین و پذیرائی کی اور اسے عرفان شناسی کے لئے نشان راہ قرار دیا ہر چند کہ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں اپنی کم علمی اور بے بضاعتی کے سبب عرفان صدیقی کی شاعری کی کما حقہ تعبیر و تفہیم نہیں کر سکا۔ مگر مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ کتاب کے پیش لفظ میں استاد محترم پروفیسر انیس اشفاق نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ ''عرفان شناسی کی راہ میں ان کی اس پہل سے ان لکھنے والوں کو ضرور تحریک ملے گی جو عرفان صدیقی کے مداح اور معترف تو ہیں لیکن جنہوں نے عرفان صدیقی پر لکھنے کا حق ابھی تک ادا نہیں کیا ہے۔'' وہ کافی حد تک سچ ثابت ہو چکی ہے چنانچہ عرفان صدیقی کے ان مداحوں نے بھی صریر خامہ کو نوائے سروش بنا لیا ہے جنہوں نے ابھی تک عرفان صدیقی کی شاعری کے حوالے سے کچھ لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ دوسری طرف یہ بات بھی خوش آئند ہے کہ برصغیر میں 'سخن عرفان' کی تعبیر و تفہیم کا رجحان ایک تحریک کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔

''عرفان صدیقی: شخص اور شاعر'' کا پہلا ایڈیشن ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا تھا اور وہ اشاعت کے چند ماہ بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔ مجتبیٰ علی خاں صاحب کافی دن سے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے لئے اصرار کر رہے تھے مگر میں چاہتا تھا کہ پہلے ایڈیشن میں کمپوزنگ کی جو غلطیاں رہ گئیں ہے انہیں درست کر دیا جائے لیکن

میں اپنی دیگر مصروفیات کے سبب ایسا نہیں کر سکا۔ میں ڈاکٹر ریشماں پروین اور ڈاکٹر ظفر النقی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا اور دونوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے از سر نو کتاب کا مطالعہ کر کے ایک اغلاط نامہ تیار کیا اور پھر اس کی بنیاد پر مسودے کی تصحیح کا کام انجام دیا۔ اس کے بعد میں نے مسودے پر نظر ثانی کی تو مطالعہ کے وقت بعض مقامات پر ترمیم واضافے کی ضرورت محسوس ہوئی لہٰذا اقتضائے حال کے مطابق مسودے میں چند تبدیلیاں کی گئیں ہیں جو مطالعہ کے دوران اہل نظر پر ظاہر ہو جائیں گی لیکن اس کے باوجود بھی یہاں دو باتوں کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ (۱) پہلے ایڈیشن میں سوانحی حصہ میں سنہ پیدائش اور ماہ پیدائش درج کیا گیا ہے مگر کسی وجہ سے تاریخ پیدائش لکھنے سے رہ گئی تھی لہٰذا اس ایڈیشن میں تاریخ پیدائش بھی تحریر کر دی گئی ہے۔ اور اسی تاریخ کو مستند سمجھا جائے کیونکہ یہ خود مجھ سے عرفان صدیقی نے بیان کی تھی نیز ان کے سرکاری اندراجات وغیرہ میں بھی یہی درج ہے۔ (۲) جہاں ان کی ازدواجی زندگی کے تعلق سے گفتگو کی گئی ہے وہاں تقریب ازدواج کا سن موجود ہے مگر تاریخ سہواً چھوٹ گئی تھی جو اس ایڈیشن میں لکھ دی گئی ہے۔ نیز اسی طرح کی دیگر پروف ریڈنگ کی خامیوں کو بھی درست کر دیا گیا ہے۔

اس دوران مجھے وقتاً فوقتاً ہمارے ناقدین اور قارئین کے بے شمار خطوط (Emails) موصول ہوئے ہیں جن میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں سے بعض اکابرین ادب کی تنقیدی تحریروں سے کچھ اقتباسات کا انتخاب کر کے ''برگ خیال'' کے عنوان سے اس ایڈیشن میں شامل کیا جا رہا ہے۔

مرزا شفیق حسین شفق

لکھنؤ

۱۰/۱/اپریل ۲۰۱۱ء

●●●

پہلا باب

سوانح اور شخصیت:

- ولادت، وطن، آباؤ اجداد، پرورش و پرداخت، تعلیم، تشکیل فکر، آغاز شاعری، ملازمت، شادی، اولاد، معاصرین، تلمذ، تلامذہ، انعام واعزاز، ادبی مشاغل، زندگی کے آخری ایام، وفات

سوانح اور شخصیت

عرفانؔ صدیقی کا پورا نام محمد عرفان احمد صدیقی ہے مگر وہ ادبی دنیا میں عرفانؔ صدیقی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش یو. پی. کے قدیم تاریخی شہر بدایوں میں ہوئی۔ اسکول اور سرکاری اندراجات کے مطابق ان کا سنہ پیدائش ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۹ء ہے۔ جہاں تک پیدائش کی اس تاریخ کا تعلق ہے اس کو مستند سمجھنا چاہیے۔ چونکہ ان کے خاندان میں بچوں کی پیدائش اور دیگر تفصیلات سے متعلق جو بیاضیں وغیرہ رکھی جاتی ہیں وہ اب دستیاب نہیں ہیں اس لئے وثوق سے اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے البتہ عام طور پر تمام متعلقہ معاملات میں ۱۱ر ستمبر ۱۹۳۹ء ہی کو ان کی تاریخ پیدائش قرار دیا گیا ہے۔

عرفانؔ صدیقی کے والد مولوی سلمان احمد ہلالیؔ تھے۔ ہلالی بدایوں میں ایڈوکیٹ تھے اور دیوانی معاملات کے خصوصی ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم اور قانون کی ڈگریاں بریلی کی مشہور اور قدیم درسگاہ بریلی کالج سے حاصل کیں جو انگریزی حکومت کے دوران ۱۸۳۷ء میں قائم کیا گیا تھا اور پہلے کلکتہ یونیورسٹی سے اور پھر آگرہ یونیورسٹی سے ملحق ہوا۔ ہلالیؔ انگریزی تعلیم اور قانون کے علاوہ فارسی اور عربی کے بھی فاضل تھے اور مولانا غوث بخش کے صاحبزادے مولانا یعقوب بخش راغبؔ کے شاگرد تھے۔ مولانا یعقوب بخش راغبؔ اپنے وقت کے فاضل اجل اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات میں سینئر استاد تھے۔ ہلالی خود صاحب دیوان شاعر تھے اور ابتدائی دور کے بعد انھوں نے اپنی شعری تخلیقات کا دائرہ نعت و منقبت تک ہی رکھا تھا ان کے دو نعتیہ مجموعے "بارش رحمت" اور

''باران رحمت'' کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوئے اس کے علاوہ ان کا نعتیہ کلام ملک کے موقر دینی و علمی جرائد میں شائع ہوتا رہا ان کا ایک خاص کارنامہ مسلم پرسنل لا کے بارے میں ایک منظوم تصنیف ہے جو ''شرع محمدی منظوم'' کے نام سے ۱۹۳۸ء میں عثمانی پریس بدایوں سے شائع ہوئی اور اپنے طرز کی ایک منفرد اور معلومات بخش تصنیف قرار دی گئی۔

عرفانؔ صدیقی کے دادا مولوی اکرام احمد شادؔ صدیقی اپنے دور کے اہم اور مستند شاعر تھے اور مولانا احسنؔ مارہروی کے شاگرد رشید تھے ان کے کلام کا انتخاب ''نغمات شاد'' کے نام سے بدایوں ہی سے شائع ہوا تھا۔ شادؔ اپنے دور کے ایک مستند ماہر علم عروض تھے لالہ شری رام نے تذکرہ ہزار داستان معروف بہ ''خم خانۂ جاوید'' میں شادؔ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''شادؔ: منشی اکرام احمد ولد مولوی اعجاز احمد صدیقی بدایونی آپ شیخ عبدالرحمٰن متولی کی اولاد میں ہیں جو شیخ عبداللہ مکی کے فرزند تھے۔ ۱۲۹۸ھ میں پیدا ہوئے، اردو، فارسی، انگریزی میں کافی استعداد ہے، آج کل آپ محکمہ پوسٹ آفس میں کلرک ہیں۔ اشعار میں حسن ترتیب، بلندیٔ فکر و سادہ بیانی کا خیال رکھتے ہیں، فن سخن میں حضرت احسن مارہروی کے شاگرد ہیں۔''
>
> (تذکرہ خم خانۂ جاوید، ص ۳۶۸، ج ۴، مطبوعہ ۱۹۲۲ء)

عرفانؔ صدیقی کے والد مولوی سلمان احمد ہلالیؔ کے نانا مولانا انصار حسین زلالیؔ بدایونی، مولانا الطاف حسین حالیؔ کے شاگرد تھے جن سے ان کے نواسے ہلالیؔ نے تعلیم و تربیت حاصل کی اور شاعری میں بھی استفادہ کیا اس طرح عرفانؔ صدیقی کو جو شعری روایت ورثہ میں ملی اس کا سلسلہ مرزا غالبؔ تک پہنچتا ہے۔

عرفانؔ صدیقی کا نسبی تعلق خاندان صدیق سے ہے جس کے جد اعلیٰ عبداللہ مکی نے بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں مکہ سے آکر بدایوں کو اپنا مستقر بنایا ان کا سلسلۂ نسب حضرت محمد بن ابی بکر کے واسطے سے حضرت ابوبکر صدیق تک پہنچتا ہے اور سبھی نسبت سے

ہاشمی ہیں ان کی نانیہال ''خاندان ہاشمیان'' بدایوں کے ممتاز خانوادوں میں سے ایک ہے جس میں علم وادب کی روایت بہت مستحکم رہی ہے ان کے مورثان اعلیٰ شمس الدین دور اکبر کے اعلیٰ منصب داراوران کے بھتیجے اور داماد ملا محمد یوسف اتالیق شہزادہ سلیم (شہنشاہ جہانگیر) تھے۔

عرفانؔ صدیقی کے خاندان میں جو بدایوں کے قدیم ترین شرفاء کا ممتاز خانوادہ تھا اور ''خاندان متولیان'' کے نام سے معروف تھا علم دین اور شعروادب کی روایت ایک طویل مدت سے قائم تھی خاندان کے بہت سے بزرگ مثلاً عیشؔ بدایونی (شاگرد امیرؔ مینائی) مولانا مفتی مجاہد الدین ذاکر بدایونی (شاگرد فراقؔ دہلوی) اور دیگر حضرات، معروف علماء دین، معتبر شاعر اور صاحب تصانیف تھے عرفانؔ صدیقی کے جد بزرگوار مولانا نیاز احمد بدایونی مشہور عالم دین اور مفسر قرآن تھے۔ ان کی والدہ کے دادا قاضی شمس الاسلام بدایونی بھی معروف عالم دین اور مفسر قرآن تھے۔ عرفانؔ صدیقی کو اس خاندانی پس منظر میں دینیات کے علاوہ شعروادب کی روایات ایک بیش قیمت و بے بہا ورثہ کی حیثیت سے ملیں۔

○

عرفانؔ صدیقی کا وطن بدایوں علم وادب کا ایک بے حد قدیم مرکز اور تاریخی حیثیت کا حامل شہر رہا ہے۔ بہت سے علماء اور اولیاء اللہ کا وطن ہونے کی بناء پر اس شہر کو ''مدینۃ الاولیاء'' کہا جاتا ہے۔ اس خاک پاک کو جن بزرگوں کا وطن ہونے کا شرف حاصل رہا ہے ان میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی، خواجہ علاء الدین حسن سنجری، حضرت خواجہ سید احمد بخاری، (والد بزرگوار حضرت محبوب الٰہی) مشہور مورخ ملاّ عبدالقادر بدایونی، ظہور اللہ نواب بدایونی جیسے عظیم افراد شامل ہیں بعد کے دور میں علم وادب کے میدان کی جن شخصیات سے بدایوں کو شرف و امتیاز حاصل رہا ہے ان میں میر محفوظ علی بدایونی، مولانا زلالیؔ بدایونی، قمرؔ بدایونی، علامہ سبطین احمد، مولانا یعقوب بخش راغبؔ بدایونی، مولوی نظام الدین حسین نظامیؔ بدایونی (سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بانی و مالک نظامی پریس بدایوں) وحید مسعود (ایڈیٹر ''نقیب'' بدایوں) مولانا عبدالماجد بدایونی (رہنما خلافت تحریک، مشہور مقرر اور علی برادران کے دست راست) مولانا عبدالقدیر بدایونی

(مفتیٔ اعظم ریاست حیدر آباد دکن) شوکت علی خان فانی بدایونی، مولانا ضیاء القادری بدایونی، علی حاتم صدیقی، آل احمد سرور، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، عالمی شہرت یافتہ سائنس داں افضال قادری، مشہور ناول نگار سلطان حیدر جوش، معروف افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی، جیلانی بانو، ممتاز جدید شاعرہ ادا جعفری بدایونی، محشر بدایونی، مشہور نغمہ نگار شکیل بدایونی، طنز و مزاح کے مشہور شاعر دلاور فگار، معروف انگریزی صحافی ایم.اے.اخیار اور مختلف علوم و فنون کے شعبوں میں بہت سے ممتاز اور سرکردہ افراد شامل ہیں۔

تاریخی حیثیت سے بدایوں مغلیہ عہد سلطنت کا اہم مرکز رہا ہے جہاں مغلیہ دور کے بہت سے آثار اور عمارات باقی ہیں۔قطب الدین ایبک کے بعد سلطان شمس الدین التمش ملک کا سلطان ہوا لیکن اس سے قبل التمش بدایوں کا گورنر رہا اور اسکی بنائی ہوئی عظیم الشان جامع شمسی اب بھی بدایوں میں موجود ہے اور ہندوستان کی تاریخی مساجد میں اپنی وسعت، صلابت اور مغلیہ دور کی تعمیراتی خصوصیات کی بناء پر بہت ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔سید خاندان کے آخری تاجدار کا مقبرہ بھی بدایوں میں ہے اور متعدد تاریخی عمارات اس شہر کی عظمت اور قدامت کی گواہی دیتی ہیں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ عرفان صدیقی کا وطن بدایوں علم و ادب کا ایک قدیم اور تاریخی مرکز رہا ہے جس سے اردو ادب کی تاریخ کے بہت سے نام وابستہ رہے ہیں جن میں بعض کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ بدایوں کی علمی، ادبی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر اس کا ذکر اکثر اہم شعراء اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں کیا ہے۔اپنے وطن کی ثقافتی علمی اور تاریخی اہمیت کے اشارے عرفان صدیقی نے اپنی طویل نظم 'سفر کی زنجیر' میں کئے ہیں جو ان کے پہلے مجموعۂ کلام 'کینوس' میں شامل ہے جسے ہم یہاں بعینہٖ نقل کر رہے ہیں اور اس کا تجزیاتی جائزہ اگلے کسی باب میں پیش کریں گے :

''شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں''
جلتی دو پہر میں پیڑی کا پُر اسرار درخت
جس سے لپٹا ہوا گزری ہوئی صدیوں کا طلسم

پہلوئے خاک میں آسودہ کوئی مرد شہید
(ذہن میں گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدا گونجتی ہے)
جاودانہ تب و تاب اور قبا خون سے تر
وہ تو زندہ ہیں مگر تم کو نہیں اس کی خبر
پتّیاں فرش پہ بکھری ہوئیں پھولوں کی طرح
اور جاروب کشی کرتی ہوئی موج ہوا
طاق میں رات کے افسردہ چراغوں کا دھواں
یہ گلی گنج شہیداں کی طرف جاتی ہے
"تم کبھی شب میں ادھر سے نہ گزرنا کہ وہاں
صف بہ صف تند فرس، سبز علم اڑتے ہیں"
مصحفی نے جو کہا ہے تمہیں معلوم نہیں؟
سرمۂ چشم ہے یہ خاک تو خسرو کے لئے
پتّیاں چنتے ہوئے دیر ہوئی، گھر کو چلو
ہم سے اگلوں نے بہت شہر کئے ہیں آباد
قافلے کتنے ہی قریوں سے ادھر آئے ہیں
بلخ، کرمان، یمن، سنجر، بخارا، فرشور
(راہداری پہ کوئی روک نہیں تھی اس وقت)
ایل و یلدوز تو خیاط و رسن تاب کہیں
چتر و اورنگ کہیں، منبر و محراب کہیں
دیکھنا، جامع شمسی میں ستوں ہیں کتنے
(ایک ہی ذوق ہے اسپین سے دوآبے تک)
معرکے، رزم گہیں، کشف، کرامات، سلوک
مدرسے، خانقہیں، جذب، مقاماتِ سماع

'یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز'
''درگہ شاہ ولایت میں جو اِک زینہ ہے
تم وہاں جا کے پکارو کسی گم گشتہ کو
سالہا سال کے کھوئے ہوئے لوٹ آتے ہیں
شرط یہ ہے کہ صداؤں کا جواب آجائے''
(اپنے کھوئے ہوئے لمحوں کو پکاریں جا کر)
سوتھ کے دونوں طرف زرد کھجوروں کی قطار
تعزیئے دفن کئے جاتے ہیں ریتی کے قریب
آگے سوروں ہے جہاں رام چرت لکھی گئی
اور گنگا کے ادھر قصبۂ پٹیالی ہے
ہم اسی مٹی سے اگنے کے لئے آئے تھے
آسمانوں میں جو دن رات یہ اڑتے ہیں جہاز
اتحادی ہیں کہ نازی ہیں کہ فسطائی ہیں
دور میدانوں میں چیلوں کی ضیافت ہوگی
کچھ عجب چیز ہے جوہر کی توانائی بھی
ایک ہی وار میں جی چھوٹ گیا ٹوجو کا
آج رومیل کو آقا نے بلایا ہے وہاں
آلِ یعقوب پہ یہ رات بہت بھاری ہے
ارضِ موعود کہاں ، گریہ کرو ، گریہ کرو
(اور مظلوم، ستم پیشہ بھی ہو جاتے ہیں)
ان کا وعدہ ہے کہ اس معرکہ سخت کے بعد
ہم تمہاری یہ امانت تمہیں لوٹا دیں گے
جن کی اقلیم پہ سورج نہیں ہوتا تھا غروب

کھولتے پھرتے ہیں خیموں کی طنابیں ہر سمت
آگ دہلیز تک آپہنچی ہے ، رفتہ رفتہ
(آج بلفاسٹ میں پھر ہو گیا ہنگامہ بپا)
"پھول" کا تازہ شمارہ نہیں آیا اب تک
تاج صاحب کی کہانی تو بہت اچھی تھی
"اب کے ہم لوگ بھی جائیں گے بناور ابا
تازہ ہولوں کا مزا اور ہی کچھ ہوتا ہے"
بار نبلیٹ کو کل دے گی وداعی دعوت
شیروانی پہ بُرش کر کے مجھے۔ دے جاؤ"
"کیا مشن کے نئے فادر بھی چلے جائیں گے"
(وہ تو بیچارے کسی کو بھی نہیں مارتے ہیں)
گھوش نے آج کے اخبار میں کیا لکھا ہے؟

پیڑ دو حصوں میں بٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟
جشن آزادیٔ جمہور منانے کے لئے
کل سے اسکول میں تعطیل رہے گی بچو!
(ڈور جب بیچ سے کٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟)
ہم بھی کل شام کی گاڑی سے چلے جائیں گے
آج ہی پاپا کا لاہور سے خط آیا ہے
ہم یہی بیل وہاں لان میں لگوائیں گے
قافلے سینۂ گیتی پہ رواں ہیں کہ جو تھے
اے زمیں، میری زمیں، اس کی زمیں، سب کی زمیں!
'مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ

ناتوانی سے حریفِ دم عیسیٰ نہ ہوا'
شعر میں کون سی تلمیح ہے تشریح کرو
نظم کی شرح اٹھاؤ میری الماری سے
'بحرِ ظلمات میں دوڑادیئے گھوڑے ہم نے'
بو الحسن جاگا تو پھر اپنے ہی گھر میں جاگا
کیوں گلیور کو کوئی اپنے برابر نہ ملا
مسئلہ شکل عروضی کا بہت مشکل ہے
ایکس کیوں سب سے یہ کہتا ہے کہ ڈھونڈو مجھ کو
آج کالج کے ڈرامے میں بہت لطف آیا
کتنا اچھا تھا شب موسم گرما کا وہ خواب
''تم میرے کمرہ میں کیوں چھوتے ہو کاغذ میرے؟
بزم اقبال کے جلسے کی یہ تیاری ہے''
(جانے تصویر وہ کس کی ہے مگر پیاری ہے)
انجمن اپنی بنالی ہے زمینداروں نے
'اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے'
''میں سمجھتا ہوں کہ روشن ہے وہاں مستقبل''
(کیا کبھی حال میں ہم لوگ نہیں جی سکتے)
اور پھر بندھتا ہے بازو پہ امامِ ضامن
''میں وہاں جا کے تمہیں، بھیجوں گا اپنی تصویر''
(اور سینے میں اتر جاؤں گا نشتر بن کر)
کسی مورث کے لئے پنج ہزاری منصب
اور تولیتِ اوقاف کا اعزاز کہیں
آگے پڑھنے کے لئے بانڈ الگ کرنے ہیں

علم صدیوں سے وراثت ہے تمہارے گھر کی
(عہد رفتہ کی مہک بند ہے صندوقوں میں)
کیسا آشوب تھا اشراف پہ ستاون میں
ان کو جس وقت فرنگی نے طپنچہ مارا
کچھ مہینوں کی دلہن ، اس کو خبر کچھ بھی نہ تھی
ہاتھ سے چھوٹ کے کنگھی گری ، اور ٹوٹ گئی
گھر کی تنہائی ڈسے لیتی ہے ، باہر چلئے
رات کو دیر تلک حلقۂ یاراں میں خروش
"آپ نے بھی ابھی کھانا نہیں کھایا افسوس
آپ اس طرح تو کمزور بنا دیں گی مجھے"
(میں نئے ملک کی سرحد سے پلٹ آؤں گا)
"رک کہ میں آیۂ کرسی تو ذرا دم کردوں"

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
ان گنت رستے ہتھیلی کی لکیروں کی طرح
ان میں کوئی کششِ کافِ کرم ہو شاید
میں کہاں جا کے رکوں گا ، مجھے معلوم نہیں
حُسن کب تجربۂ ذات میں ڈھل پائے گا
ظلمتیں ، روشنیاں ، سلسلۂ شام وسحر
سب تماشا ہے تو تقریبِ تماشا کیا ہے ؟
حلقہ در حلقہ پر اسرار سفر کی زنجیر
دیکھتے جاؤ کہ تم نے ابھی دیکھا کیا ہے ؟

(ناتمام)

اس پوری نظم میں عرفان صدیقی نے اپنا تاریخی، تہذیبی اور ادبی پس منظر پیش کیا

ہے اور اپنے وطن بدایوں کی عظمت و رفعت کو بیان کیا ہے۔ عرفان صدیقی کا وطن بدایوں مسلمانوں کی ثقافت و تہذیب کا ایک قدیم مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ہندو کلچر اور علم و ادب کا بھی ایک بہت اہم مرکز رہا ہے اس بستی کی ابتداء ''بودھ'' دور سے بتائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ ویدوں کی تعلیم کا بڑا مرکز تھا اور اسی لئے بعض لوگ اس کا قدیم نام ''ویدامئو'' بتاتے ہیں۔

بدایوں کی اہمیت کا اعتراف قدیم زمانے سے کیا جاتا رہا ہے اس سلسلے میں بعض مشاہیر شعراء و ادباء کے یہاں بھی اعترافیہ اشعار مل جاتے ہیں مثلاً حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بدایونی معروف بہ محبوب الٰہی کے چہیتے مرید اور عظیم شاعر حضرت امیر خسرو کا مشہور شعر ہے:

ز بس کز مرکز اہل بصیرت منبع جود است
بجائے سرمۂ دردیدہ کشم خاک بدایوں را

یا مصحفی کا مشہور شعر ہے:

قاتل تیری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں
جس کے ہر ایک گھر میں مزارِ شہید ہے

ان کے علاوہ بدایوں سے متعلق بے شمار حوالے کسی نہ کسی پہلو کو نمایاں کرتے ہوئے اردو کے تذکروں اور کتابوں میں موجود ہیں:

از خاک بدایونے ترسم کہ دگر خیزد
آشوب ہلاکوئے ہنگامۂ چنگیز ے

مندرجہ بالا شعر اس زمانے کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس میں بدایوں میدان جنگ بنا ہوا تھا یہ شعر علامہ اقبال سے منسوب ہے۔

O

عرض کیا جا چکا ہے کہ عرفان صدیقی نے جس ماحول اور جس فضا میں ہوش سنبھالا اس میں ہر طرف علم و ادب خصوصاً شاعری کا چرچہ تھا اور قدیم ثقافتی روایات کے نمائندہ

افراد ان کے اپنے گھر میں موجود تھے۔ عرفاؔن صدیقی کے والد مولوی سلمان احمد ہلاؔلی ان کے چچاؤں میں محشؔر بدایونی اور دلاورفگاؔر، ان کے دادا مولوی اکرام احمد شاؔد صدیقی، پردادا مولوی اعجاز احمد صدیقی اور ان کے خاندانی بزرگوں میں مولانا انصار حسین زلاؔلی (شاگرد حاؔلی)، علامہ سبطین احمد اور حضرت عیشؔ (شاگرد امیؔر مینائی) حکیم مجاہد الدین ذاکؔر (شاگرد فراؔق) ان کے نانا قاضی رضی الاسلام وصلؔ اور بہت قریبی خاندانی اعزا میں بہت سے دوسرے ادیب وشاعر تھے جن میں سے بیشتر کی شفقت وتربیت کا فیض عرفاؔن صدیقی نے حاصل کیا ان کی والدہ رابعہ خاتون کلثوؔم بدایونی بھی اردو شاعری اور فارسی میں اچھی دسترس رکھتی تھیں اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والی خاتون تھیں اور خاندان کی روایات کے زیر اثر خود بھی نعت ومنقبت میں شعر کہتی تھیں ان کی نعت کا ایک مشہور شعر ملاحظہ فرمائیں:

زندگی بھر کے لئے ان کی تمنا پائی
اور کیا چاہئے اب ان کے تمنائی کو

ہماری اب تک کی گفتگو سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ عرفاؔن صدیقی کے گھر میں علم وادب کی مستحکم روایات تھیں اور ان کے اثرات ان کے فکر وفن پر بہت گہرے مرتب ہوئے یہ ایک آسودہ حال زمیندار گھرانہ تھا جس کی علمی، ادبی اور ثقافتی روایات وآداب اس کی شناخت تھے۔ عرفان صدیقی کے بڑے بھائی نیاز احمد نیاؔز صدیقی نوجوان شعراء میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے اور کالج ویونیورسٹی کے زمانے میں ایک اچھے مقرر کی حیثیت سے ملک بھر میں پہچانے جاتے تھے۔ نیاؔز کے دوستوں میں فرخؔ جلالی، افضاؔل شیروانی، عبدالباری تسنیؔم، اخلاق اخترؔ حمیدی اور شکیب جلالی جیسے نوجوان ادیب وشاعر شامل تھے جنھوں نے آگے چل کر ادب، سیاست، صحافت اور شاعری میں امتیازی مقام حاصل کیا۔

عرفان صدیقی نے اپنے ابتدائے ایام کے ہنگاموں اور محفل آرائیوں کا ذکر شکیبؔ جلالی کے شعری مجموعے ''روشنی اے روشنی'' کے پیش لفظ میں ''آگ کے دریاؤں کا مسافر'' کے عنوان سے کیا ہے، ذیل میں ان کے مضمون کے چند اقتباسات دیئے جا رہے ہیں جس سے ان کے ابتدائی دور کے منظر نامے کے ساتھ ساتھ دیگر اہم معلومات بھی ہمیں

دستیاب ہوتی ہیں:

''آج میں موسموں کی کتاب کے بیس یا بائیس ورق الٹتا ہوں تو کچھ دھندلے عکس اجاگر ہو کر بولتی تصویروں میں بدل جاتے ہیں اور کتنی ہی بھولی بسری یادیں مجسم ہو جاتی ہیں۔ چوتھائی صدی پہلے زندگی اتنی دل شکن معلوم نہ ہوتی تھی۔ نئی عصری حقیقتیں اس چھوٹی سی بستی کے دروازے پر بھی دستک دے رہی تھیں لیکن آنکھوں میں گزری ہوئی روایتوں کے عکس ابھی جاگ رہے تھے جو نسل اس وقت بدایوں میں جوان ہو رہی تھی اس کے ہاتھوں میں ماضی کے دامن کی مہک باقی تھی اور آنکھوں میں آنے والے برسوں کے خواب جگمگا رہے تھے ادبی محفلیں، مباحثے، رسالوں کا اجراء، ڈرامے، ادبی اور ثقافتی انجمنوں کا قیام، گہری خاموش بامعنی دوستیاں، دلنواز رقابتیں اور بااصول وسیع القلب دشمنیاں، کچھ کر دکھانے کے حوصلے۔''

عرفان صدیقی اپنے برادر کبیر نیاز احمد صدیقی کے دوستوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''نیاز یعنی میرے بھائی صاحب کے دوستوں کا حلقہ یوں بہت وسیع تھا لیکن ان کے قریب ترین ہم مذاق ساتھیوں میں شکیبؔ جلالی، افضالؔ شیروانیؔ، عبدالباری تسنیم، اخلاق اخترؔ حمیدی اور فرخؔ جلالی شامل تھے ان کے علاوہ اور بھی دوست تھے لیکن ذہنی رفاقت کی بناء پر یہ لوگ بیشتر ہر ادبی ہنگامے میں ساتھ ہی ہوتے تھے۔ فرخؔ جلالی کو چھوڑ کر جو ان دنوں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ لائبریری سائنس سے وابستہ ہیں باقی سب دوست رفتہ رفتہ پاکستان چلے گئے اس کوہ ندا کی طرف جو یا اخی پکارتا رہتا ہے اور حوصلہ مند ذہین خواب دیکھنے والے نوجوان جس کی وسعتوں میں گم ہوتے رہتے ہیں یہ حوالے شاید شخصی محسوس ہوں مگر میرے لئے شکیبؔ کی ذات کو اس پس منظر سے الگ کر کے دیکھنا اور سمجھنا مشکل ہے۔ ہمارے گھر کا مردانہ حصہ ان نوجوانوں کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا مباحثے ہوتے تھے ادبی مقابلے اور شعری محفلیں برپا کی جاتی تھیں ادبی رسالے نکالے اور بند کئے جاتے تھے، انجمنیں قائم کی

جاتی تھیں ابا مرحوم (دادا جان قبلہ شاؔد بدایونی) ایک مشفقانہ تبسم سے کبھی کبھی اظہار پسندیدگی فرماتے تھے، کبھی والد کچہری اور موکلوں سے فارغ ہوتے تو تقسیم انعامات کے لئے تشریف لاتے اور یوں بھی ہوتا کہ انجمن سازی میں اگر کوئی قضیہ پیدا ہو جاتا تو اس کے فیصلے کے لئے ابا مرحوم سے رجوع کیا جاتا، ماضی کا تناور درخت ابھی سایہ کئے ہوئے تھا اور اس کی چھاؤں میں ذہن اور شعور پنپ رہا تھا۔ شکیبؔ تب تک شکیبؔ جلالی نہ بنا تھا لیکن شعر کہتا تھا شعر سناتا تھا مباحثوں میں حصہ لیتا تھا اور نیازؔ کے ساتھ کالج کی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں میں آگے آگے رہتا تھا یہ پوری نسل مجھ سے سات آٹھ سال آگے تھی اس لئے ہمارے سماجی اسٹیٹس میں اسی اعتبار سے فرق تھا۔ میں اور میرے دو تین ساتھی ان محفلوں اور ہنگاموں کے بس تماشائی تھے یا زیادہ سے زیادہ صف آخر کے حاضرین۔"

عرفان صدیقی نے پاکستان کو کوہ ندا سے تشبیہ دی ہے اور کوہ ندا کی صفت یہ ہے کہ جس نے اس کی آواز پر دھیان دیا اور لبیک کہا وہ اس کی وسعتوں میں ایسا گم ہوا کہ کبھی واپس نہیں آسکا۔ یہی تقسیم ملک کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ ہوا کہ انہیں پاکستان کے حوالے سے ایسے دلفریب خواب دکھائے گئے کہ جن کی تعبیر کی تلاش میں انہوں نے اپنے اسلاف کی سرزمین کو چھوڑ کر نقل مکانی کی ناقابل برداشت اذیتیں اٹھائیں مگر وہاں ان کے حصہ میں صرف ناکامیاں اور مایوسیاں ہی آئیں اور ان کے اخلاف کو مسلکی منافرت اور لسانی عداوت ورثہ میں ملی، بدایوں سے کس طرح ایک ایک کر کے نیازؔ صدیقی کے دوست ترک وطن کر رہے تھے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے عرفان صدیقی لکھتے ہیں:

"پھر یوں ہوا کہ محفل تتر بتر ہوگئی۔ ہوائیں سمت غیب سے پہلے ہی چل رہی تھیں کچھ جھونکوں نے دوستوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ تسنیمؔ اور اخلاق اخترؔ کے بعد شکیبؔ بھی ایک دن خاموشی سے ترک وطن کر گئے۔ پھر افضالؔ شیروانی نے رخت سفر باندھا۔ فرخؔ جلالی نے علی گڑھ بسایا کچھ دن نیازؔ تنہا تنہا سے اس شاخ نہال غم کی آبیاری کرتے رہے پھر بریلی کالج چلے گئے۔

۱۹۵۵ء کی گرمی کی چھٹیوں میں اپنے فائنل امتحانات سے فارغ ہو کر بھائی صاحب بدایوں آئے ہوئے تھے مجھے ان کے کمرے میں جا کر ان کتابوں، رسالوں، خطوں اور ڈائریوں کو چوری چھپے پڑھنے کی شروع سے عادت رہی تھی۔ کبھی کبھی پکڑا بھی جاتا تھا اب کی بار ان کی ڈاک میں بڑا خوبصورت ماہنامہ بھی شامل تھا "جاوید" جو لاہور سے نکل رہا تھا پہلے صفحہ پر مدیر کی جگہ جلی قلم میں لکھا تھا شکیبؔ جلالی، رسالہ بے حد خوبصورت لگا پورا رسالہ بڑے ستھرے مذاق اور گہرے شعور کا آئینہ دار تھا دو ڈھائی سال کی مختصر مدت میں شکیبؔ نے وہاں خود کو نہ صرف ایک منفرد اور باشعور غزل گو کی حیثیت سے متعارف کرا لیا تھا بلکہ ادبی صحافت کے معیاروں کی تلاش میں کئی منزلیں طے کر لی تھیں۔ رسالہ کے ساتھ ہی بھائی صاحب کے نام ایک خط بھی آیا تھا:

نیازؔ تم وہاں سے یہاں کی زندگی کا اندازہ نہیں کر سکتے، اچھا ہوں، شب و روز کی نہ پوچھو! دن "مغربی پاکستان" (اس نام کا سرکاری رسالہ جس سے شکیبؔ وابستہ ہو گئے تھے) کی نذر ہو جاتا ہے اور رات کشاکشوں میں کٹ جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک غزل کہی ہے اس سے کچھ اندازہ کر سکتے ہو کیا گزر رہی ہوگی:

یہ جھاڑیاں ، یہ خار ، کہاں آ گیا ہوں میں
اے حسرت بہار کہاں آ گیا ہوں میں
کیا واقعی نہیں ہے یہ موسیقیوں کا شہر
کیوں چپ ہیں نغمہ کار کہاں آ گیا ہوں میں

کچھ دن بعد بھائی صاحب بھی چلے گئے۔ شکیبؔ وہیں لاہور میں تھا اور بھائی صاحب کراچی میں لیکن اکثر نصف ملاقاتیں اور کبھی بھائی صاحب کے لاہور جانے پر پوری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔"

بالآخر وہی ہوا جس کا عرفانؔ صدیقی کو خدشہ تھا۔ نیازؔ صدیقی زیادہ دن تک شاخ نہال غم کی آبیاری نہیں کر سکے اور یہ کشش کاف کرم کی جستجو میں اسی کوہ ندا کی وسعتوں میں کھو گئے جہاں تسنیمؔ، اخلاقؔ اختر، افضالؔ اور شکیبؔ کسی قریہ معتبر کی تلاش میں بھٹک رہے

تھے۔ عرفانؔ صدیقی نے اپنے بڑے بھائی نیازؔ صدیقی کو وطن میں روکنے کے لئے ہزاروں جتن کیے، سیکڑوں دلیلیں دیں اور طرح طرح کی تدبیریں کیں مگر نیازؔ کی اس دلیل نے سب کو بے اثر کر دیا 'میں سمجھتا ہوں کہ روشن ہے وہاں مستقبل' اور عرفانؔ صدیقی بھائی سے یہی پوچھتے رہ گئے 'کیا کبھی حال میں ہم لوگ نہیں جی سکتے؟'' حال بھی تو کسی ماضی ہی کا مستقبل ہے۔'

روشن مستقبل کے سنہری خوابوں نے جوشؔ ملیح آبادی اور قرۃ العین حیدر کو بھی ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا مگر وہاں زندگی کا تصور توقعات کے برخلاف نکلا۔ جوشؔ کی غیرت مند طبیعت نے دوبارہ ہجرت کرنا گوارا نہیں کیا البتہ قرۃ العین حیدر 'آگ کے دریا' کو عبور کر کے وطن واپس آگئیں۔

عرفانؔ صدیقی پر نیازؔ کی جدائی کا جو اثر ہوا اس نے انہیں اندر سے شکستہ کر دیا مگر انہوں نے ایسے حالات میں بھی حوصلہ نہیں ہارا اور از سر نو اپنے مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں مصروف ہو گئے جس کی غمازی ان کی اس غزل سے ہوتی ہے:

تم ہمیں ایک دن دشت میں چھوڑ کر چل دیے تھے تمہیں کیا خبر، یا اخی
کتنے موسم لگے ہیں ہمارے بدن پر، نکلنے میں یہ بال و پر، یا اخی
شب گزیدہ دیاروں کے ناقہ سواروں میں مہتاب چہرہ تمہارا نہ تھا
خاک میں مل گئے راہ تکتے ہوئے سب خمیدہ کمر بام و در، یا اخی
یہ بھی اچھا ہوا تم اس آشوب سے اپنے سرسبز بازو بچا لے گئے
یوں بھی کوئے زیاں میں لگانا ہی تھا ہم کو اپنے لہو کا شجر، یا اخی

○

عرض کیا جا چکا ہے کہ عرفانؔ صدیقی کے گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا اسی علمی اور ادبی ماحول میں انہوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ یہ اپنے اسکول ہی کے زمانے میں تقریری و تحریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور ہمیشہ امتیازی مقام حاصل کرتے تھے اور نو برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے، ان کی طالب علمی کے زمانے کی شاعری کا اندازہ ان کی نظم 'دہقاں اور گریجویٹ' سے بحسن و خوبی لگایا جا سکتا ہے، ان کی یہ نظم اسلامیہ انٹر کالج بدایوں

کی سالانہ میگزین میں ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی تھی:

وقت:

چرخِ نیلی پر غروب آفتابی کا سماں
تیرگی میں رات کی جیسے ضیائے کہکشاں
طائروں کی واپسی کا وہ تماشائے جمیل
جیسے آوارہ فضائے دشت میں بانگ رحیل

منظر:

وادیوں کے زیر و بم میں پیچ و خم کھاتا ہوا
ایک دہقاں جا رہا تھا زیرِ لب گاتا ہوا
ہر قدم پر اک نیا نغمہ نئے انداز میں
سیکڑوں طوفان خوابیدہ شکستہ ساز میں
اک جواں سے راہ میں اس کا تصادم ہو گیا
اور لبوں پر ناچتا گاتا ترنم ہو گیا

گریجویٹ:

آہ دہقاں مادر گیتی کی فرزند عظیم
سادگی پر ہے تیری حیرت زدہ عقل سلیم
کچھ تجھے آرائش و آرام کی پروا نہیں
کام کرتے وقت صبح و شام کی پروا نہیں
ڈانس اور تھیٹر سے، بے بہرہ ہے تیری زندگی
اور ایسے میں سخن پیرا ہے تیری زندگی

دہقاں:

کیوں تعجب ہے مری نغمہ سرائی پر تجھے
یہ حقیقت ہے نہیں آرام کی پروا مجھے

مادر گیتی کا سینہ چیرتا جاتا ہوں میں
چند سکے خوں کی محنت کے عوض پاتا ہوں میں
لیکن اس سادہ دلی سے خوش بہت ہوتا ہے دل مرا
خوشۂ گندم ہے اک اک حاصلِ منزل مرا
ڈانس سے بڑھ کر ہے رقص طائراں میرے لئے
پردۂ سیمیں ہے اوج آسماں میرے لئے
گردش آفاق کا ہے کون نوکر تو کہ میں؟
تو ہی بتلا دے کہ ہے پھر کون برتر تو کہ میں؟

عرفان صدیقی کا پہلا مضمون چندر بردائی کی رزمیہ نظم ''پرتھوی راج راسو میں عربی فارسی الفاظ'' ۱۹۵۴ء میں ''آج کل'' (دہلی) کے کسی شمارے میں چھپا تھا اس وقت یہ دسویں جماعت کے طالب علم تھے۔ ۱۹۵۵ء سے ان کی شعری تخلیقات اردو کے موقر جرائد ورسائل میں شایع ہونا شروع ہوگئی تھیں۔

عرفان صدیقی نے ابتدائی تعلیم مشن اسکول اور اسلامیہ انٹر کالج بدایوں سے اور اعلیٰ تعلیم بریلی کالج بریلی سے حاصل کی (جو ملک کے قدیم ترین کالجوں میں سے تھا) جس میں پوسٹ گریجویٹ سطح تک مختلف مضامین کی تعلیم کا انتظام تھا اور آگرہ یونیورسٹی سے الحاق تھا۔ (بعد میں موجودہ روہیل کھنڈ یونیورسٹی کا مرکزی تعلیمی ادارہ بنا) بریلی کالج سے انھوں نے انگریزی ادب اور سوشلوجی (عمرانیات) میں امتیازی نمبروں سے ۱۹۵۷ء میں بی.اے. کیا پھر عمرانیات میں ۱۹۵۹ء میں ایم.اے. کیا۔ اسی دوران ان کا انتخاب ایک مقابلے کے امتحان کے بعد مرکزی اطلاعاتی سروس میں ہوگیا جو مرکزی وزارت واطلاعات ونشریات کی ایک کل ہند سروس ہے اور اب اس کا نام انڈین انفارمیشن سروس ہے۔

O

۱۹۶۲ء میں عرفان صدیقی کا تقرر مرکزی اطلاعاتی سروس دہلی کے وزارت کے پریس انفارمیشن بیورو میں ہوا۔ اس وقت دہلی میں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے بیچ کی دہائی ادب وفنون

کی بڑی سرگرمیوں کی دہائی تھی اور۱۹۶۲ء کے وسط میں جب انھوں نے ملازمت کا آغاز کیا تو اس وقت پریس انفارمیشن بیورو نہ صرف وزارت کے دوسرے شعبہ مثلاً پبلکیشنز ڈویژن، آل انڈیا ریڈیو اور ڈی .اے .وی. پی. بھی اردو اور دوسری زبانوں کے اہم ادیبوں اور دانشوروں کا مرکز تھے۔ پی.آئی.بی. کا دفتر اس وقت آکاش وانی بھون میں واقع تھا اور اس کے برابر ہی میں آل انڈیا ریڈیو کا براڈ کاسٹنگ ہاؤس تھا اور یہ دونوں عمارتیں پارلیمنٹ روڈ پر ایک ہی احاطے میں واقع تھیں۔ اس وقت پی.آئی.بی. اور ریڈیو میں جو اہم ادیب اور دانشور کام کرتے تھے۔ ان میں جگن ناتھ آزاد، علی جواد زیدی، پریم ناتھ درد، این. کے بامزئی، ساغر نظامی، سید آل حسن، سلام مچھلی شہری، عمیق حنفی، دیوکی نندن پانڈے، سید آل عبا مارہروی (حضرت آوارہ یہ اردو کے بزرگ اور صاحب اسلوب مزاح نگار کے طور پر کافی شہرت اور وقعت رکھتے تھے ان کی کتاب ''بے پر کی'' طنز و مزاح میں خاصی اہمیت کی حامل ہے آوارہ عرفان صدیقی کی اہلیہ سیدہ حبیب کے چچا تھے۔) اشوک باجپئی، شہریار پرواز، زبیر رضوی، مصطفیٰ علی اکبر، صہبا وحید قریشی، جگدیش چندر، عظیم اختر وغیرہ کے علاوہ وزارت کے دوسرے شعبوں میں 'آج کل' کے مدیر عرش ملسیانی، راج نارائن راز، شہباز حسین، مہدی عباس حسینی اور بہت سے دوسرے نوجوان ادیب و شاعر شامل تھے۔ پی.آئی.بی. میں جہاں عرفان صدیقی کا پہلا تقرر اردو پبلسٹی کے شعبہ میں ہوا، مشہور شاعر اور ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد شعبے کے سربراہ تھے اور ان کے تبادلے کے بعد اردو کے مشہور نقاد اور معتبر ترقی پسند مصنف علی جواد زیدی نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ عرفان صدیقی کو معاون افسر کی حیثیت سے ان دونوں حضرات کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ اس وقت جو ادیب عرفان صدیقی کے ہم کار تھے ان کے علاوہ بھی ادب اور صحافت سے متعلق اہم شخصیات مختلف کاموں سے اس دفتر میں آیا جایا کرتی تھیں ان میں ''ٹائمس آف انڈیا'' کے مدیر شیام لال، فنون لطیفہ کے نقاد اتیا ملک، مشہور مصور ستیش گجرال، انگریزی کے سرکردہ صحافی و مصنف خوشونت سنگھ اور مشہور صحافی محمد سبحان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حکومت ہند کے اس اہم شعبہ کے سربراہ اس وقت مشہور انگریزی صحافی ایم ایل. بھاردواج

تھے اور وزارت واطلاعات ونشریات کی وزیر محترمہ اندرا گاندھی تھیں جو آگے چل کر ہندوستان کی وزیراعظم بنیں۔ پی.آئی.بی. میں دوسرے شعبوں کی اہم ذمہ داریوں پر آج کے بزرگ اور مشہور انگریزی صحافی کلدیپ نیر، مطالعات پریم چند کے ماہر مدن گوپال، مشہور ناول نگار شمشیر سنگھ نرولہ اور فنون لطیفہ کے معتبر اور اہم ناقد کے، کے، نائر فائز تھے۔ مذکورہ بالا شخصیات سے ان کے قریبی اور مخلصانہ تعلقات ہونے کی وجہ سے عرفان صدیقی کو اپنی شعری اور ادبی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ ان سرگرمیوں کو تیز کرنے کا اچھا موقع ملا۔

دہلی میں وہ 'ٹی ہاؤس' اور 'انڈیا کافی ہاؤس' کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت ان دونوں مقاموں کو مرکزیت حاصل تھی جہاں نہ صرف دہلی بلکہ ملک بھر کے ادیب، صحافی اور دانشور بیٹھتے تھے اور ادب وفنون کا چرچہ ہمہ وقت رہتا تھا۔ ٹی ہاؤس اور انڈیا کافی ہاؤس دونوں ہی دارالحکومت دہلی میں علم ودانش کی علامت تھے اور یہاں آنے والے بے شمار اہم افراد میں اردو کے جو ادیب ہوتے تھے ان میں مشہور افسانہ نگار دیویندر سیتارتھی، 'تحریک' کے مدیر گوپال متل، 'تلاش' کے مدیر وشوناتھ درد، 'محور' کے مدیر نریندر نشچل، سلام مچھلی شہری، من چندہ بانی، محمود ہاشمی، بلراج مین را، سریندر پرکاش، عمیق حنفی، شمس الرحمن فاروقی، سجاد ظہیر، گلزار دہلوی، مخمور سعیدی، انصار ہروانی، ایم. پی. (مجاز کے چھوٹے بھائی) پروفیسر نثار احمد فاروقی، مشہور مصور مقبول فدا حسین وغیرہ شامل تھے۔ ٹی ہاؤس کے بند ہونے اور قریب ہی 'نیو انڈیا کافی ہاؤس' کے ایک وسیع خیمہ گاہ میں منتقل ہونے کے بعد دہلی کی ادبی، علمی اور صحافتی سرگرمیوں کا مرکز 'نیو انڈیا کافی ہاؤس' ہی بن گیا تھا دفتر کے بعد اسی مرکز پر عرفان صدیقی اور ان کے احباب شریک محفل رہتے تھے اس کے علاوہ ان کا دہلی میں جن بزرگ شخصیات سے گہرا تعلق رہا ان میں مولانا عثمان فارقلیط (مدیر اعلیٰ روزنامہ ''الجمعیت'') پروفیسر محمد مجیب (شیخ الجامعہ، جامعۂ ملیہ اسلامیہ) پروفیسر مرزا محمود بیگ، مولانا محمد ادریس (امام جماعت، جامع مسجد پارلیمنٹ روڈ نئی دہلی) نورالدین احمد (میئر دہلی) مولانا اسعد مدنی کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ عرفان صدیقی نے ملازمت کا آغاز پریس انفارمیشن بیورو

سے کیا اور پھر اپنی ملازمت کے دوران وہ سروس کے مختلف شعبوں مثلاً آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن، فیلڈ پبلسٹی ڈیفینس ونگ وغیرہ میں اہم ذمہ دار عہدوں پر کام کرتے رہے اور انہیں ان کی امتیازی خدمات پر انعام واعزاز سے نوازا جاتا رہا ہے۔ اسی دوران انھوں نے مرکزی ابلاغ عامہ اداروں سے جرنلزم کے کورس کیے اور اسناد حاصل کیں۔

○

۱۹۷۴ء میں عرفان صدیقی کا دہلی سے لکھنؤ تبادلہ ہوگیا اور انھوں نے دہلی کو خیر باد کہہ کر لکھنؤ کو آباد کیا:

ابھی کھلا بھی نہ تھا رخت شوق دلی میں
کہ پھر ہمیں کشش لکھنؤ بلانے لگی

عرفان صدیقی لکھنؤ میں اسٹیٹ انفارمیشن افسر (اردو) بنا کر بھیجے گئے تھے اور ان کا دفتر پی. بی. آئی. حضرت گنج میں واقع تھا۔ اس زمانے میں شمس الرحمن فاروقی بھی ڈائرکٹر پوسٹل سروسز تھے اور ان کا دفتر بھی حضرت گنج ہی میں تھا۔ اس وقت عرفان صدیقی کا حلقۂ احباب بہت مختصر تھا:

خیر دلی میں تو اوراق مصور تھے بہت
لاؤ اس شہر کی گلیوں میں بھی جا کر دیکھیں

لکھنؤ کی دلکشی اور خوبصورتی کے باوجود عرفان صدیقی دلی اور ارباب دلی کو نہیں بھلا سکے۔ لکھنؤ میں انھیں دلی اور اہل دلی کی یاد مسلسل آتی رہی جس کا ذکر ان کے اشعار میں بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی کو دلی سے بے پناہ انسیت ہوگئی تھی اس سلسلے میں اس زمانے میں ان کی ایک غزل دہلی اور لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی تھی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

کتنے دلدار تھے ارباب ستم دلی کے
چین ملتا ہے تو یاد آتے ہیں غم دلی کے
کتنی بھولی ہوئی یادوں نے سنبھالا دل کو
جیسے پردیس میں ہوں دوست بہم دلی کے

جانے کیوں کوئی سندیسہ نہیں لاتی پچھوا
کیا ہمیں بھول گئے اہل کرم دلی کے
چاہے جس شہر میں رہ آئیں مگر رہتے ہیں
زندگی دلی کی دل دلی کا ہم دلی کے
یوں تو بت خانہ ہے یہ شہر بھی لیکن عرفاںؔ
آج تک پھرتے ہیں آنکھوں میں صنم دلی کے

اس دوران لکھنؤ میں عرفان صدیقی کا جن بزرگ شخصیتوں سے تعلق رہا ان میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا منظور نعمانی، مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی، مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیبؔ اور مرزا جعفر حسین کے اسماء قابل ذکر ہیں۔

لکھنؤ کی دوسری اہم ہستیاں جن سے عرفان صدیقی کی مخلصانہ قربت رہی ان میں پروفیسر نیر مسعود، مولانا کلب عابد، پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی، مولانا آغا روحی عبقاتی، ڈاکٹر کلب صادق، جمیل مہدی، (مدیر عزائم) ہاشم رضا عابدی الہ آبادی (مدیر قومی جنگ) صباح الدین عمر، ڈاکٹر کیسری کشور، صلاح الدین عثمان، تصور حسین زیدی، آنند نرائن ملا، حیات اللہ انصاری، مفتی رضا انصاری، پروفیسر محمود الہی، عشرت علی صدیقی، پروفیسر نور الحسن ہاشمی، نسیم انہونوی، حکیم عبدالقوی دریا آبادی، نسیم احمد (مالک دانش محل) عمر انصاری، شجاعت علی سندیلوی، سید نواب افسر، فضل نقوی، ولی الحق انصاری، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، شمس الرحمن فاروقی، چودھری علی مبارک عثمانی، ابوالقاسم خاں، استاد مبارک حسین، مولانا اسحاق جلیسؔ ندوی، سالکؔ لکھنوی، ساحر لکھنوی اہم ہیں۔

عرفان صدیقی کے ہم عصر احباب کا حلقہ خاصا وسیع تھا جس میں شہنشاہ مرزا، زیبؔ غوری، پروفیسر انیس اشفاق، ابوالحسنات حقی، ساغرؔ خیامی، وقار ناصری، رتن سنگھ، اقبال مجید، والی آسی، عثمان غنی، شاہ نواز قریشی، احمد جمال پاشاؔ، رام لال، بشیشر پردیپ، غلام رضوی گردش، محمد مسعود، یاور علی، شکیل صدیقی، قمر احسن، سید رونق رضا ٹسوی، اختر الملک، مرغوب حسن خاں، حفیظ نعمانی، شمس فرخ آبادی، انجم ملیح آبادی، شفاعت علی صدیقی،

سلمان عباسی، جمیل الرحمن کے تذکرہ کے بغیر ان کے احباب کی فہرست سازی ناممکن ہے۔

O

عرفاں صدیقی ملازمت میں ترقی کے مختلف مدارج طے کرتے ہوئے۔ ۱۹۹۷ء میں حکومت ہند کے ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر کے عہدے پر پریس انفارمیشن بیورو کے علاقائی دفتر کے سربراہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ پینتیس سالوں پر محیط اس طویل مدت کے دوران عرفان صدیقی نے اپنی منصبی اور صحافتی ذمہ داریوں کو کامیابی سے نبھانے کے ساتھ ساتھ نئی غزل کے ایک اہم شاعر کی حیثیت سے ممتاز مقام حاصل کیا اور اس طرح انہوں نے اپنی دفتری اور ادبی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی نبھایا۔ عرفان صدیقی نے اس کی طرف ایک شعر میں بڑا لطیف اشارہ کیا ہے:

ہمارے دل کو ایک آزار ہے ایسا نہیں لگتا
کہ ہم دفتر بھی جاتے ہیں غزل خوانی بھی کرتے ہیں

دراصل عرفان صدیقی نے شاعری کو کبھی پیشہ نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ اسے اپنے احساسات و جذبات کی ترجمانی کا وسیلہ سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام نہ صرف برصغیر (ہندوپاک) کے اعلیٰ اور وقیع ادبی جرائد ورسائل میں اہتمام وامتیاز کے ساتھ چھپتا رہا ہے بلکہ اردو دنیا کے ادبی جرائد ورسائل ان کے کلام کو شائع کرنا باعث افتخار سمجھتے ہیں۔

O

عرفاں صدیقی کے پانچ شعری مجموعے ارباب فکر ونظر کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کے دلدادگان سے بھی زبردست خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں ان کے ان مجموعوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

کینوس	۱۹۷۸ء
شب درمیاں	۱۹۸۴ء
سات سماوات	۱۹۹۲ء
عشق نامہ	۱۹۹۷ء

ہوائے دشت ماریہ	۱۹۹۸ء
دریا (کلیات)	۱۹۹۹ء

ان شعری مجموعوں کے علاوہ عرفانؔ صدیقی نے کالی داس کی نظم ''رتو سمہارم'' کا اردو منظوم ترجمہ ''رت سنگھار'' کے نام سے کیا ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا اور کالی داس ہی کے ایک ابتدائی ڈرامے ''مالویکا اگنی متر'' کا ترجمہ براہ راست سنسکرت سے اردو میں کیا ہے۔ یہ ترجمہ منظوم و منثور دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس ڈرامے کو اتر پردیش اردو اکادمی نے ۱۹۸۳ء میں لکھنؤ سے شائع کیا۔ مراقش کے ادیب محمد شکری کے سوانحی ناول ''روٹی کی خاطر'' کا ترجمہ بھی ان کے تراجم میں شامل ہے اس کے علاوہ انھوں نے ترسیل عامہ کے موضوع پر دو کتابیں ''رابطۂ عامہ'' مطبوعہ ۱۹۷۷ء اور ''عوامی ترسیل'' (آر. کے. چٹر جی) مطبوعہ ۱۹۸۴ء بھی لکھیں جو علی ہذا الترتیب مکتب جامعہ دہلی اور نیشنل بک ٹرسٹ دہلی نے شائع کی ہیں۔ عرفان صدیقی نے صحافت، ادب اور ثقافت کے موضوعات پر بہت سے مضامین لکھے، اور ریڈیو اور ٹی. وی. کے لئے مختلف موضوعات پر فیچر وغیرہ بھی تحریر کئے ہیں۔ یہ ریڈیو اور ٹی. وی. کے ایک کمپیئر کی حیثیت سے بھی ممتاز رہے ہیں۔

○

عرفانؔ صدیقی کی شادی اتر پردیش کے مشہور خانقاہی خانوادۂ برکاتیہ مارہرہ شریف ضلع ایٹہ میں ۷ر ستمبر ۱۹۶۳ء میں محترمہ سیدہ حبیب سے ہوئی۔ سیدہ حبیب سادات زیدی الواسطی خانوادے سے ہیں اور ان کے خاندان کے دو بڑے مرکز بلگرام اور مارہرہ ہیں جن میں شاہ برکت اللہ پیمی مارہروی جیسے عظیم المرتبت صوفی، غالبؔ کے دوست صاحب عالم مارہروی اور شاہ ابوالحسن احمد نوری، مولانا سید آل مصطفیٰ مارہروی، (جو سید آل عبا آوارہ مارہروی کے بیٹے تھے اور ممبئی کی مسجد ''کھڑگ'' کے پیش امام اور سنی جمعیت العلماء کے صدر رہتے تھے۔) کے علاوہ مارہرہ اور بلگرام کے متعدد صوفیاء اور ادباء وغیرہ کے نام شامل ہیں نئی نسل میں نوجوان افسانہ نگار سید محمد اشرف اور مارہرہ کے سجادہ نشین سید محمد امین بھی ان کے خانوادے کی ایک فرد ہیں۔

○

عرفان صدیقی کی پانچ اولادوں میں ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں، سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ چاروں بیٹیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ اپنے اپنے گھر میں خوش وخرم ہیں ان چاروں بیٹیوں میں بڑی بیٹی مینا عرفان نے آئی.ٹی.کالج سے بی.اے.آنرز کیا ہے اور شادی کے بعد آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ میں نیوز ریڈر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ مینا عرفان کے شوہر حسن ابرار نوجوان صحافی ہیں اور لکھنؤ یونیورسٹی کے اورینٹل اسٹیڈیز ڈپارٹمنٹ کے سابق صدر ڈاکٹر انوار الحسن مرحوم کے بیٹے ہیں۔ دوسری بیٹی نغمہ عرفان لکھنؤ یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ سوشلوجی میں ایم.اے.کرنے کے بعد دوردرشن میں اردو کی نیوز ریڈر ہیں اور ان کے شوہر ڈاکٹر شمشاد اختر ایل.این.متھلا یونیورسٹی دربھنگہ (بہار) میں لکچرر ہیں۔ عرفان صدیقی کے بیٹے خالد عرفان 'فیضی' ان دونوں سے چھوٹے ہیں اور انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے فرسٹ کلاس میں انجینئرنگ کی ڈگری لی اور آج کل دبئی میں ملٹی نیشنل کمپنی میں سینئر انجینئر کے عہدے پر کام کر رہے ہیں۔ خالد عرفان کی شادی کرجہاں ضلع دیوریا کے نجیب الطرفین سادات گھرانے میں سید عبدالولی کی بیٹی ڈاکٹر سیدہ ادیبہ ولی سے ہوئی ہے۔ حال ہی میں ان کے یہاں ایک فرزند کی ولادت ہوئی ہے۔ اس نومولود کا نام حضرت علیؑ سے گہری عقیدت کی وجہ سے خود عرفان صدیقی نے اپنی زندگی ہی میں علی تجویز کیا تھا۔ تیسری بیٹی رومانہ عرفان نے بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ہی بی.ایس.سی آنرز اور بی.اے.اور ایم.بی.اے.کی ڈگریاں فرسٹ ڈویژن میں حاصل کی ہیں اور اس وقت اترپردیش گورنمنٹ کے کارپوریشن کے لکھنؤ دفتر میں منیجر کے عہدے پر فائز ہیں اور ان کے شوہر سید محمد اجمل لکھنؤ ہی میں سافٹ ویئر انجینئر ہیں اور یہ مولانا عبدالحلیم شررؔ کے پوتے غنی اکبر کے بیٹے ہیں۔ چھوٹی بیٹی لبنیٰ عرفان نے لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم، اے کیا ہے اور ان کے شوہر محمد سیف صدیقی ہیں جو ایم.بی.اے.کرنے کے بعد نوئیڈا میں ایک پرائیویٹ کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔

○

عرفان صدیقی کے معاصرین میں علم وادب اور سیاست وثقافت کے سرکردہ اور

اہم افراد کے نام شامل ہیں اور ان کے ادبی معاصرین میں پروفیسر نیر مسعود، شمس الرحمن فاروقی، شہریار، پروفیسر انیس اشفاق، زیب غوری، صہبا وحید، شہزاد احمد، قمر جمیل، سلیم احمد، عبید اللہ علیم، پروفیسر انور مسعود، پروفیسر توصیف تبسم، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، فیصل عجمی، عنبر بہرائچی، زبیر رضوی، ابوالحسنات حقی، عظیم اختر، عشرت ظفر، فرخ جعفری، پریم کمار نظر، آصف فرخی، خواجہ رضی حیدر اور ہندو پاک کے بہت سے دوسرے ادباء و شعراء شامل ہیں ان کے بزرگ قدردانوں میں پروفیسر آل احمد سرور، احمد ندیم قاسمی، محمود ایاز، عزیز حامد مدنی اور تصور حسین زیدی کے اسماء گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردانوں کا ایک بہت وسیع حلقہ اردو دنیا میں موجود ہے۔

O

شاعری اور ادب میں وہ باضابطہ نہ کسی استاد شاعر کے شاگرد رہے اور نہ ان کے تلامذہ کا کوئی رسمی حلقہ ہے انھوں نے اپنے ماحول اور روایات کے ساتھ ساتھ اپنے مطالعے اور ریاض سے رہنمائی حاصل کی ہے اور اپنے نوجوان ساتھیوں اور ادیبوں کو اپنا ادبی ہمسفر جانا ہے البتہ شعر و ادب کے شعبے میں مشورۂ سخن کرنے والوں کا حلقہ خاصا وسیع ہے۔

عرفان صدیقی اپنے گوشۂ عافیت کو ترجیح دینے والے مزاج کی بدولت رسمی ادبی اعزازات و انعامات کی فکر میں کبھی نہیں رہے۔ یہ اس طرح کے جھمیلوں سے ہمیشہ دور رہے ان کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے:

رکھنا یا فہرست میں تم میرا نام نہ رکھنا
مجھ کو اس الجھن سے کوئی کام نہ رکھنا

اس کے باوجود ان کے ادبی خدمات کو تسلیم کیا گیا اور اتر پردیش اردو اکادمی کا مجموعی خدمات کا سب سے بڑا انعام انھیں پیش کیا گیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کی جانب سے ''غالب ایوارڈ'' (برائے شاعری) اور میر اکادمی لکھنؤ نے ''نشان امتیاز'' ادارہ لوح و قلم لکھنؤ نے ''اعزاز مصحفی'' اور علی مشن لکھنؤ نے حضرت علیؑ کے چہاردہ صد سالہ جشن ولادت پر ''علیؑ صدی ایوارڈ'' سے نوازا۔ اس کے علاوہ ہندوستان و پاکستان کی کئی اہم ادبی انجمنوں

نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں سپاس نامے پیش کیے۔

عرفان صدیقی مشاعروں میں اگر چہ عام طور سے شرکت نہیں کرتے تھے اور اس معاملے میں ان کا رویہ احتیاطی اور انتخابی تھا تاہم انھوں نے ہندوستان، پاکستان، عرب امارات، عمان، امریکہ، کناڈا، انگلینڈ وغیرہ کے اہم ترین مشاعروں اور ادبی اجتماعات میں میزبانوں کے اصرار پر شرکت کی۔

O

عرفان صدیقی کے محبوب مشاغل میں شاعری بنیادی حوالہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تصنیف و تخلیق میں سرگرم اور علم وادب کے مختلف شعبوں میں فعال رہے حال ہی میں انھوں نے ساہتیہ اکادمی (دہلی) کیلیے انگریزی میں دور قدیم اور دور وسطیٰ کے اردو ادب کا ایک جامع انتخاب (۱۱۰۰ءتا ۱۸۵۰ء) کیا تھا جس میں شاعری اور نثر کے بہت سے نمونوں کا ترجمہ بھی کیا ہے اور ایک مبسوط پیش لفظ بھی لکھا اور یہ انتخاب ساہتیہ اکادمی نئی دہلی سے جلد ہی شائع ہونے والا ہے۔ عرفان صدیقی نے اتر پردیش کے ایک اہم اردو روزنامہ ''صحافت'' (لکھنؤ) کے مدیر اعلیٰ کے خدمات بھی ایک طویل عرصہ تک انجام دیئے۔ اس کے علاوہ انگریزی اور اردو کے اخبارات میں مختلف موضوعات پر ان کے کالم اور مضامین شائع ہوتے رہتے تھے اور آخر ایام میں 'شب عاشور' کے متعلق مرثیہ اور تقسیم ملک و ہجرت کے موضوع پر ناول لکھنے میں مشغول ومصروف تھے۔ مرثیہ کا مطلع مصطفیٰ زیدی نے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا ہے:

جب گل چراغ انجمن شام ہو گیا
تاروں کی بزم نور میں کہرام ہو گیا
کل ہوگی جنگ عام یہ پیغام ہو گیا
معلوم جانثاروں کو انجام ہو گیا
ہرگز نہ یاں سے لوٹ کے جانے کو آئے ہیں
زیرِ زمین چھاونی چھانے کو آئے ہیں

مذکورہ مرثیہ پروفیسر نیر مسعود نے عرفان صدیقی کی زبانی سنا تھا اور مجھے پروفیسر نیر مسعود

نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ اس مرثیہ کے تقریباً ۷۰ بند لکھ چکے تھے۔ ابھی مرثیہ ناتمام ہی تھا کہ ان کی زندگی تمام ہوگئی۔

○

۸/اکتوبر ۲۰۰۳ء کو عرفان صدیقی پر مرض کا پہلا حملہ ہوا اور وہ پی۔جی۔آئی میں داخل ہوئے، چند دنوں کے بعد صحت یاب ہو کر گھر واپس آگئے۔ اس دوران ان سے ملنے کے لئے جو بھی آیا اور انہیں صحت مند دیکھ کر اس نے خوشی کا اظہار کیا تو وہ اسے خوش آثار دیکھ کر صرف اتنا کہتے تھے کہ 'جن کا مداح ہوں انہوں نے مجھے اپنی مدحت کے صلے میں نئی زندگی دی ہے' اور یہ کہتے کہتے ان کی آواز گرفتہ اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں اور اسی حالت میں وہ یہ منقبت پڑھنے لگتے:

دل سوزاں پہ جیسے دست شبنم رکھ دیا دیکھو
علیؑ کے نام نے زخموں پہ مرہم رکھ دیا دیکھو
طلسم شب میری آنکھوں کا دشمن تھا سو مولا نے
لہو میں اک چراغ اسم اعظم رکھ دیا دیکھو
سخی داتا سے انعام قناعت میں نے مانگا تھا
میرے کشکول میں خوان دو عالم رکھ دیا دیکھو
کھلا آشفتہ جانوں پر علم مشکل کشائی کا
ہوائے ظلم نے پیروں میں پرچم رکھ دیا دیکھو
شہ مرداں کے در پر گوشہ گیری کا تصدق ہے
کہ میں نے توڑ کر یہ حلقۂ رم رکھ دیا دیکھو

جن لوگوں نے عرفان صدیقی سے ان کی زندگی کے آخری ایام میں ملاقاتیں کی ہیں انہوں نے عرفان صدیقی کی محمد وآل محمد علیہم السلام سے والہانہ محبت کی کیفیت کو ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ جب اسپتال میں تھے تب بھی اور جب گھر آگئے تھے اس وقت بھی محمد وآل محمد علیہم السلام کا ذکر کرتے کرتے زار وقطار رونے لگتے اور شدت گریہ سے ان کی آواز گلوگیر ہو جاتی مگر وہ

اس حالت میں بھی حضرت علیؑ کی منقبت پڑھتے رہتے تھے۔ جیسا کہ پروفیسر نیر مسعود نے اپنے ایک مضمون 'عرفان صدیقی کی منقبتی شاعری' میں لکھا ہے:

''عرفان صدیقی کو مرض موت سے جو وقتی افاقہ ہوا تھا اس میں ان کی زبان پر حضرت علیؑ کا نام رہتا تھا، کبھی وہ ان کے فضائل بیان کرتے اور کبھی اپنے منقبتی شعر پڑھتے تھے، کبھی نہج البلاغہ کے اقتباسات سناتے تھے۔''

(حدیث دل، ص ۵، شمارہ ۱۳، جولائی ۲۰۰۶ء، دہلی)

عرفان صدیقی کی اس کیفیت کا ذکر وقار ناصری، محمد مسعود اور خورشید اکرم نے بھی اپنے مضامین میں کیا ہے۔ حضرت علیؑ سے عرفان صدیقی کو بے پناہ عقیدت تھی اس سلسلہ میں پروفیسر نیر مسعود نے اپنے ایک اور مضمون ''عرفان صدیقی: آخری ملاقاتیں'' میں لکھا ہے کہ:

''حضرت علیؑ سے ان کو بڑی عقیدت تھی ان کے جد محمد ابن ابی بکر تھے جن کو حضرت علیؑ حضرت ابو بکر کے صلب سے اپنا بیٹا کہتے اور بہت عزیز رکھتے تھے۔ آخری جنگوں میں وہ حضرت علیؑ کی فوج کے جانباز سپاہی تھے۔ جنگ صفین میں حریف کے ہاتھوں بڑی بے دردی سے قتل کیے گئے۔ اس پس منظر کے علاوہ بھی عرفان صدیقی کو حضرت علیؑ سے خاص عقیدت تھی اور ان کی ذات میں انہیں اپنا مثالی انسان نظر آتا تھا انہوں نے کئی منقبتیں کہیں جن میں حضرت علیؑ سے استغاثہ کیا گیا۔ انہیں مولا علیؑ کا لقب 'مشکل کشا' اور 'شاہ مرداں' بہت پسند تھا۔''

(ماہنامہ نیا دور، عرفان صدیقی نمبر، ص ۸۸، نومبر ۲۰۱۰ء)

عرض کیا جا چکا ہے کہ عرفان صدیقی کو حضرت علیؑ سے گہری عقیدت تھی اور حضرت علیؑ سے محمد بن ابی بکر کی وابستگی کے سبب وہ ذریت محمد بن ابی بکر ہونے پر بھی فخر و مباہات کرتے تھے۔ درحقیقت انہیں اس نسبت پر بڑا ناز تھا یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں بھی بعض مقامات پر اس افتخار کا ذکر موجود ہے۔

میں آلِ خانہ زادِ علیؑ ، ان کا ریزہ خوار
قسمت نہ ہو تو کوئی یہ نسبت کہاں سے لائے

عرفان صدیقی جب کسی مشکل میں گرفتار ہوتے تھے تو اپنے سارے معاملات کو مشکل کشا پر چھوڑ دیتے تھے۔ ایک بار ان کا تبادلہ لکھنؤ سے دہلی کر دیا گیا اور عرفان صدیقی دہلی جانا نہیں چاہتے تھے مگر ان کے محکمہ کے اعلیٰ افسران نے ان کی ایک نہ سنی اور عرفان صدیقی کو بادل نخواستہ دہلی جانا پڑا۔ انہوں نے وہاں پہنچ کر لکھنؤ تبادلے کی کوششیں شروع کر دیں مگر کوئی تدبیر کام نہیں آئی بالآخر انہوں نے اپنا عریضہ شاہ مرداں کی بارگاہ میں بھیجا اور معاملہ حل ہو گیا ان کے مخالفین کے سارے منصوبے ناکام ہو گئے اور ان کا تبادلہ فوری طور پر لکھنؤ ہو گیا۔ ان کی یہ منقبت اسی زمانے کی یادگار ہے:

ہم دل فگار آج دلاور بھی ہو گئے
بے تیغ و تیر، شحنۂ لشکر بھی ہو گئے
ہم نے کہا نہ تھا کہ ہیں مشکل کشا علیؑ
وہ معرکے جو بس میں نہ تھے سر بھی ہو گئے
نافذ ہوا وہی شہ مرداں کا فیصلہ
دشمن کے دستخط سر محضر بھی ہو گئے

عرفان صدیقی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اسپتال (پی.جی.آئی.) کے بستر پر جو منقبت کہی ہے اس کا ایک ایک لفظ محمد وآل محمد علیہم السلام سے ان کی گہری عقیدت کا مظہر ہے۔ وہ ان ذوات مقدسہ کو کائنات میں سب سے افضل و بہتر سمجھتے تھے جس کا اظہار انہوں نے بارہا اپنی منقبتی شاعری میں کیا ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ ہر مشکل میں حضرت علیؑ ہی کو پکارتے تھے ان کی اس پکار کا ایک ایک حرف ان کی آخری شعری تخلیق میں صاف طور پر سنائی دیتا ہے:

کوئی ستارہ کوئی روشنی دکھائیں علیؑ
بہت اندھیرا ہے دل میں مدد کو آئیں علیؑ
یہ غم ہے ایک سمندر تو مجھ کو پار لگائیں
پہاڑ ہے تو اسے راہ سے ہٹائیں علیؑ

غبار تنگ زدۂ راہوار کی مانند
میں پائے بوس رہوں جس طرف بھی جائیں علیؑ
نہیں مجھے طرف وسمت کا شعور نہیں
فرس سے باندھ کے باہر نکال لائیں علیؑ

O

جب پہلی بار عرفان صدیقی صحت یاب ہو کر گھر آئے تھے تو ادارۂ لوح وقلم (رجسٹرڈ) نے افتخار الملک نواب سید افتخار علی خاں فخر کے زیر سرپرستی ''خاقان منزل'' میں بڑے ہی تزک واحتشام کے ساتھ عرفان صدیقی کا جشن صحت منایا لیکن اس موقع پر صرف انہیں لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا جن سے عرفان صدیقی کا گہرا تعلق تھا۔ جشن کا آغاز خود عرفان صدیقی نے اپنی غزلوں سے کیا تھا، انہوں نے پہلی غزل کی شروعات کچھ اس طرح کی تھی:

ہم سے وہ جان سخن ربط نوا چاہتی ہے
چاند ہے اور چراغوں سے ضیاء چاہتی ہے
اس کو رہتا ہے ہمیشہ مری وحشت کا خیال
میرے گم گشتہ غزالوں کا پتا چاہتی ہے
میں نے اتنا اسے چاہا ہے کہ وہ جان مراد
خود کو زنجیر محبت سے رہا چاہتی ہے
چاہتی ہے کہ کہیں مجھ کو بہا کر لے جائے
تم سے بڑھ کر تو مجھے موج فنا چاہتی ہے
روح کو روح سے ملنے نہیں دیتا ہے بدن
خیر یہ بیچ کی دیوار گرا چاہتی ہے
ہم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہیں آزاد
گھر کو چلتے ہیں کہ اب شام ہوا چاہتی ہے
ہم نے ان لفظوں کے پیچھے ہی چھپایا ہے تجھے
اور انہیں سے تری تصویر بنا چاہتی ہے

جس وقت عرفان صدیقی یہ غزل پڑھ رہے تھے سامعین نقش حیرت بنے ہوئے تھے، ان کی خوانندگی سے کسی طرح بھی ایسا محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ یہ مرض موت کا مقابلہ کر کے آ رہے ہیں۔ ان کا شعر پڑھنے کا انداز بالکل پہلے جیسا تھا، وہی لہجے کی کھنک، وہی مسحور کر دینے والی آواز اور وہی سامعین پر چھا جانے والی کیفیت، غزل مکمل ہوئی تو سامعین نے ایک اور غزل کی فرمائش کر دی، پہلے عرفان صدیقی نے انکار کیا اور پھر سامعین کے اصرار پر دوسری غزل کا مطلع پڑھا:

میرے ہونے میں کسی طور سے شامل ہو جاؤ
تم مسیحا نہیں ہوتے ہو تو قاتل ہو جاؤ
دشت سے دور بھی کیا رنگ دکھاتا ہے جنوں
دیکھنا ہے تو کسی شہر میں داخل ہو جاؤ
جس پہ ہوتا ہی نہیں خون دو عالم ثابت
بڑھ کے اک دن اسی گردن میں حمائل ہو جاؤ
وہ ستمگر تمہیں تسخیر کیا چاہتا ہے
خاک بن جاؤ اور اس شخص کو حاصل ہو جاؤ
عشق کیا کار ہوس بھی کوئی آسان نہیں
خیر سے پہلے اسی کام کے قابل ہو جاؤ
ابھی پیکر ہی جلا ہے تو یہ عالم ہے میاں
آگ یہ روح میں لگ جائے تو کامل ہو جاؤ
میں ہوں یا موج فنا اور یہاں کوئی نہیں
تم اگر ہو تو ذرا راہ میں حائل ہو جاؤ

اس کے بعد محفل سماع کا اہتمام کیا گیا تھا جب مغنی نے "من کنت مولاہ فھذا علی مولا" کہہ کر اپنے کلام کی ابتدا کی تو اہل محفل کے ساتھ ساتھ عرفان صدیقی بھی وجد میں آ گئے تھے۔ شاید یہ ان کی زندگی کی آخری نشست تھی جس میں انہوں نے سامعین کو براہ راست اپنے کلام سے محظوظ کیا، اس وقت تک ڈاکٹروں نے کینسر سے متعلق تشکیک کا اظہار ہی کیا

تھا مگر دوبارہ جب مرض کا حملہ ہوا تو معالجین نے کینسر کی تشخیص کر دی اور اس بار مرض کا یہ حملہ جان لیوا ثابت ہوا، بالآخر اس حملہ نے ۱۵/اپریل ۲۰۰۴ء مطابق ۲۴/صفر المظفر ۱۴۲۵ھ بروز جمعرات بوقت ۸/بجے شب اس شعر وسخن کی شمع کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے گل کر دیا اور پھر عرفان صدیقی کو عقیدت مندوں کے جم غفیر نے ۱۶/اپریل ۲۰۰۴ء مطابق ۲۵/صفر المظفر ۱۴۲۵ھ بعد نماز جمعہ ڈالی گنج کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا۔ عرفان صدیقی کا جسد خاکی ضرور رزق خاک بن چکا ہے مگر ان کی آفاقی شاعری اور قاموسی شخصیت ہمیشہ دنیائے شعر وسخن کو رزق علم وآگاہی عطا کرتی رہے گی۔

عرفان صدیقی کی وفات حسرت آیات پر بہت سے شعراء نے قطعات تاریخ کہے ہیں لیکن ہم یہاں پروفیسر ولی الحق انصاری کا قطعۂ تاریخ نقل کر رہے ہیں جو فارسی ادب کی قد آور شخصیت ہیں اور عرفان صدیقی کو بہت عزیز رکھتے ہیں نیز ان کی شاعری کے مداح اور معترف بھی ہیں، انہوں نے قطعۂ تاریخ میں عرفان صدیقی کی شخصیت اور شاعری کے دونوں پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے:

جہاں! تجھ سے عرفان رخصت ہوا
وہ دو دن کا مہمان رخصت ہوا
تھی پندرویں اپریل کی رات، جب
وہ بیمارِ سرطان رخصت ہوا
بنایا تھا 'قندیل' کس چاو سے
اُسے کر کے ویران رخصت ہوا
'صحافت' کو بے آسرا چھوڑ کر
ادب کا نگہبان رخصت ہوا
ولی نے کہی اس کی تاریخ مرگ
صد افسوس عرفان رخصت ہوا
۱۲+ ۱۲۹۰ + ۴۰۱ + ۲۰۷ +۹۴

۲۰۰۴ء

●●●

دوسرا باب

نئی اردو شاعری:

- غزل کے نئے افکار و اقدار
- غزل کے نئے موضوعات و اسالیب

غزل کے نئے افکار واقدار

ہماری شاعری کو نئے موضوعات و مسائل سے ہم آہنگ کرنے کا مطالبہ انیسویں صدی کے اواخر میں ہی کیا جانے لگا تھا انجمن پنجاب لاہور کا قیام اسی مقصد کے ماتحت عمل میں آیا تھا۔ حالیؔ اور آزاد نے مناظموں کی مہم اسی لئے شروع کی تھی کہ معاصر شعراء کو بدلتے ہوئے حالات اور نئے تقاضوں سے روشناس کرایا جائے۔ شاعری میں تبدیلیوں کا مطالبہ کرنے والے یہ شاعر محسوس کررہے تھے کہ ایک سے موضوعات کو مسلسل دہرائے جانے کی بناء پر شاعری کا دائرہ تنگ ہوگیا ہے اور اب ضرورت ہے کہ شاعری میں نئے موضوعات ومضامین کی نمائندگی کی جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد معاشرتی، سیاسی اور قومی شعور بیدار ہونے لگا تھا اور یہ محسوس کیا جانے لگا تھا کہ اب بیرونی تسلط کے سائے میں جینے کا ہندوستانی عوام کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا چنانچہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں قومی اور سیاسی سطح پر ایک ذہنی اضطراب پیدا ہونے لگا، اس اضطراب کا اظہار طرح طرح سے ہورہا تھا اور ادب وشاعری میں بھی صاف طور پر نظر آتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ دوسری طرف انگریزوں کے غلبہ کی بناء پر ہم نئے علوم وافکار سے بھی آشنا ہونے لگے تھے انھیں علمی اور سماجی تبدیلیوں کو محسوس کرتے ہوئے حالیؔ اور آزاد نے روایتی شاعری کا افق بدلنے کا مطالبہ کیا اور غزل کے مقابلے میں نظم کہنے پر اس لئے اصرار کیا گیا کہ نظم کے ذریعہ ہم نئے موضوعات کو زیادہ وسعت اور وضاحت کے ساتھ بیان کرسکتے ہیں ان شاعروں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ان موضوعات کے عملی نمونے پیش کئے، یہ صحیح ہے کہ

اس زمانے میں انجمن پنجاب کے مناظموں کی مہم کی بناء پر نئے معاملات ومسائل کی عکاسی کے اعتبار سے نظم غزل پر حاوی رہی لیکن رفتہ رفتہ غزل میں بھی ان موضوعات کی بازگشت سنائی دینے لگی ابھی شاعری میں نئے موضوعات کی ترجمانی کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا کہ انیسویں صدی نے بیسویں صدی کے دروازے پر دستک دینا شروع کردی اور مسائل کی دنیا میں اور زیادہ تغیر ہونے لگا۔ بیسویں صدی کے دوسرے دہے میں پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی اسی دہے میں روس میں انقلاب برپا ہوااور اس انقلاب کے تین سال بعد ''جلیان والا باغ'' کا سانحہ رونما ہواان واقعات نے مسائل کی ایک نئی دنیا کو جنم دیا تیزی سے بدلتے ہوئے مسائل کی اس دنیا کے ساتھ ساتھ ہمارے شعور وفکر کی دنیا بھی تبدیل ہو رہی تھی۔ پہلی جنگ عظیم نے جہاں ہمیں جنگ کی ہولناکی کا احساس دلایا وہیں انقلاب روس نے ہمارے اندر نیا سماجی شعور پیدا کیا اور ہم مارکس کے سماجی فلسفے کو اپنی نجات کا وسیلہ سمجھنے لگے، اس صدی کے تیسرے دہے تک آتے آتے ہماری ذہنی دنیا بھی بڑی حد تک بدل چکی تھی۔ نئے علوم وافکار کی روشنی عام ہو رہی تھی اور ہم سیاسی اور سماجی سطح پر نئے معنوی اقدار سے روشناس ہونے لگے تھے۔ شعور وفکر کی اسی تبدیلی کے زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اس انجمن نے شعر وادب کی تخلیق کے لئے جس سماجی فلسفے کو اپنا نصب العین قرار دیا اس نے ایک نئی ادبی صورتحال کو جنم دیا اب ادب میں سماجی موضوعات ومسائل کی نمائندگی پر زور دیا جانے لگا اور یہ کہا جانے لگا کہ ان موضوعات ومسائل کو بالواسطہ یا اشاراتی انداز کے بجائے صاف اور واشگاف لہجے میں پیش کیا جائے یعنی نہ صرف سیاسی وابستگی پر اصرار کیا گیا بلکہ اس وابستگی کے اظہار کے لئے لب ولہجہ کی تبدیلی کو بھی ضروری سمجھا گیا چنانچہ ترقی پسند شعراء نے نئے ادبی تقاضوں کے ماتحت اپنی شاعری میں عصری موضوعات ومسائل کی عکاسی کی اور باطنی دنیا کے بجائے خارجی دنیا کی ترجمانی کی یعنی اب ظلم، ناانصافی، عدم مساوات، مفلسی، استحصال، جبر اور آزادی خواہی کے موضوعات ہماری شاعری کے مرکز میں آگئے گویا اس عہد کی شاعری انھیں اقدار کی ترجمانی کر رہی تھی۔ ذیل میں انھیں موضوعات ومسائل سے متعلق چند منتخب اور نمائندہ اشعار ملاحظہ ہوں:

خنجروں کی سازش پر کب تلک یہ خاموشی
روح کیوں ہے یخ بستہ، نغمہ بے زباں کیوں ہے

یہ محفل ہے کہ قتل گاہ ہے اہل تمنا کی
یہاں تو بات کرنے پر بھی کٹتی ہے زباں ساقی

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب، کوچۂ قاتل کے سوا

علی سردار جعفری

یہ خوں کی مہک ہے کہ لب یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دستک دی
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے

آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

فیض

لمحے بھر کو یہ دنیا ظلم چھوڑ دیتی ہے
لمحے بھر کو سب پتھر مسکرانے لگتے ہیں

ہوا ہے حکم کہ کیفی کو سنگسار کرو
مسیح بیٹھے ہیں چھپ کے کہاں، خدا جانے

کیفی

طلسمِ خوابِ غفلت توڑ کر بیدار ہوتے ہیں
سنبھل جا، نشۂ دولت کہ ہم ہشیار ہوتے ہیں

زمیں لرزاں زماں لرزاں نگاہِ اہرمن لرزاں
کہ اب تیور ہمارے انقلاب آثار ہوتے ہیں
وامقؔ

خاموش ہیں کیوں نالہ کشانِ شبِ ہجراں
یہ تیرہ شبی آج بھی کچھ کم تو نہیں ہے

دھوکا نہ تھا نظر کا تو پھر اے شب دراز
وہ ہلکے ہلکے صبح کے آثار کیا ہوئے
جذبیؔ

تمہارے جسم کا سورج جہاں جہاں ٹوٹا
وہاں وہاں مری زنجیر جاں بھی ٹوٹی ہے

ہر شام سجائے ہیں تمنا کے نشیمن
ہر صبح مئے تلخیٔ ایام بھی پی ہے
مخدومؔ

خنجر کی طرح بوئے سمن تیز بہت ہے
موسم کی ہوا اب کے جنوں خیز بہت ہے

آتی ہی رہی ہے گلشن میں اب کے بھی بہار آتی ہے تو کیا
ہے یوں کہ قفس کے گوشوں سے اعلانِ بہاراں ہونا تھا
مجروحؔ

اسی سبب سے ہیں ہم پر عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو ، پلکوں پہ خواب جتنے ہیں

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا برا ہے جو یہ افواہ اڑادی جائے

جاں نثار اختر

وہاں بھیجا گیا ہوں چاک کرنے پردۂ شب کو
جہاں ہر صبح کے دامن پہ عکس شام ہے ساقی

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں

ساحر

سوچتے کیا ہو جلاتے رہو زخموں کے چراغ
دیکھتے کیا ہو ، ابھی صبح کے آثار کہاں

رہ و رسم شوق کی قید بھی بڑی خوشگوار سی قید تھی
مجھے یوں لگا کوئی شاخ گل میرے بال و پر میں الجھ گئی

تاباں

درج بالا اشعار اس امر کے غماز ہیں کہ ترقی پسند شاعروں نے ایک مخصوص سماجی نظریے کی روشنی میں اپنے عہد کے موضوعات و مسائل کی کامیاب ترجمانی کی اگر چہ ان مسائل کی عکاسی میں انھوں نے فن کے بنیادی مطالبے کو فراموش کر دیا تاہم ان شعروں میں ان کا عہد سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ سردار، فیض، کیفی، وامق، جذبی، مخدوم، مجروح، جاں نثار اختر، ساحر، تاباں وغیرہ نے اپنی شاعری میں ہمیں نئے افکار اقدار سے متعارف کرایا لیکن رفتہ رفتہ ان تمام شاعروں کے یہاں بہ استثنائے فیض یکسانی پیدا ہونے لگی۔

دوسری طرف ۱۹۴۷ء میں ہمارا ملک آزاد ہو گیا لیکن ملک کے آزاد ہوتے ہی ہمیں نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا یوں بھی چالیس کے دہے میں دوسری جنگ عظیم برپا ہونے سے ہم ایک نئے عالمی مسئلے سے دوچار ہو رہے تھے آزادی کے بعد تقسیم کا المیہ، تقسیم کے بعد فسادات، اس سلسلۂ عمل نے ہندوستانیوں کو اندر اور باہر سے ہلا کر رکھ دیا، فسادات کے نتیجے میں ہر طرف تعصب اور نفرت کے شعلے بھڑک اٹھے، مذہبی جنون نے سیاسی اور سماجی انتشار، تہذیبی واخلاقی انحطاط اور عوام میں انسانیت، مساوات واخوت جیسی اعلیٰ اقدار کی طرف سے بے یقینی پیدا کر دی بقول پروفیسر انیس اشفاق:

''جس وقت ترقی پسند افکار کی معنویت ختم ہو رہی تھی اور ایک نیا نظام اقدار وجود میں آرہا تھا ادبی اعتبار سے یہ جمود و تعطل کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں ایک کے بعد ایک حیران کن اور المناک واقعات رونما ہوئے جنھوں نے ہمیں ذہنی طور پر متزلزل کر دیا دوسری جنگ عظیم تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات نے ہم پر گہرے اثرات مرتب کئے ہم پر مایوسی، بے یقینی، تنہائی، لاحاصلی اور عدم تحفظ کے احساسات طاری ہونے لگے ان المیہ احساسات کی وجہ سے خارج سے ہمارا رابطہ ٹوٹنے لگا اور باطن کو ہم نے اپنی پناہ گاہ سمجھ لیا۔ دوسری طرف اس عہد کے بعض نئے افکار واقدار (وجودیت وغیرہ) نے بھی ہمیں متاثر کیا اور ہم نے وجود کے پیچ وخم کو سمجھنا چاہا چنانچہ اس عہد میں درون کی جستجو اور اس کے انکشاف کو ہم نے اپنی تخلیق کا مرکز بنالیا''۔

(بیسویں صدی میں اردو غزل، مشمولہ بحث وتنقید، ص ۱۱۳، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۹ء)

اس بدلتی ہوئی ذہنی اور سماجی صورت حال نے ادبی اور سماجی اقدار کو بھی تبدیل کر دیا۔ ایک طرف ملکی اور بین الاقوامی مسائل کی بنا پر انسانیت پر سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا اور وجود کی معنویت پر سوالیہ نشان قائم کیا جانے لگا۔ دوسری طرف ہم اپنے ذہنی مسائل کے اظہار کے لئے نئے تخلیقی پیرایوں کی جستجو کرنے لگے۔ ترقی پسند افکار واقدار کے بے معنی ہو جانے کے بعد اپنی ذہنی اور باطنی دنیا سے متعلق مسائل کے اظہار کے لئے ان پیرایوں کی جستجو ہمارے لئے ضروری بھی تھی۔ ذیل میں انھیں پیرایوں پر مشتمل اشعار پیش

کئے جا رہے ہیں:

گزر رہے ہیں عجب مرحلوں سے دیدہ و دل
سحر کی آس تو ہے زندگی کی آس نہیں

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

پہاڑوں سے چلی پھر کوئی آندھی
اڑے جاتے ہیں اوراق خزانی

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ، اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

وہ رنگ دل کو دیئے ہیں لہو کی گردش نے
نظر اٹھاؤں تو دنیا نگارخانہ لگے

ناصر کاظمی

کہوں کس سے رات کا ماجرا نئے منظروں پہ نگاہ تھی
نہ کسی کا دامن چاک تھا نہ کسی کی طرف کلاہ تھی

مرے چار دانگ تھی جلوہ گر وہی لذت طلب سحر
مگر ایک امید شکستہ پر کہ مثال درد سیاہ تھی

اگر دیکھیں تو چپ لگ جائے ان ساحل نشینوں کو
جو طغیانی سکوت سینۂ دریا میں اٹھی ہے

دھوئیں سے آسماں کا رنگ میلا ہوتا جاتا ہے
ہرے جنگل بدلتے جا رہے ہیں کارخانوں میں

خشک تالاب، ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں، ادھ کھلے پھول پر سوختہ کھڑکیاں
پھر کوئی شہر آنکھوں میں پھرنے لگا پھر مجھے راستے یاد آنے لگے

احمد مشتاق

تنہا اجاڑ برجوں میں پھرتا ہے تو منیر
وہ زر فشانیاں تیرے رخ کی کدھر گئیں

جب سفر سے لوٹ کر آئے تو کتنا دکھ ہوا
اس پرانے بام پر، وہ صورتِ زیبا نہ تھی

اک تیز رعد جیسی صدا ہر مکان میں
لوگوں کو ان کے گھر میں ڈرا دینا چاہیے

اک چیل ایک ممٹی پہ بیٹھی ہے دھوپ میں
گلیاں اجڑ گئی ہیں مگر پاسباں تو ہے

اک آسیبِ زر ان مکانوں میں ہے
مکیں اس جگہ کے سفر پر گئے

منیر نیازی

ساری ساری رات جلے ہیں جو اپنی تنہائی میں
ان کی آگ سے صبح کا سورج اپنا دیا جلاتا ہے

کیا کہیں ہم کہ ازل سے ہی ملی تھی ہم کو
ایسی تنہائی کہ تم سے بھی مداوا نہ ہوا

ہنگامۂ حیات سے جانبر نہ ہو سکا
یہ دل عجیب دل ہے کہ پتھر نہ ہو سکا

سب سوئے اپنی اپنی چادر میں منہ چھپا کر
اک میری بیکسی ہے جو اب بھی جاگتی ہے

پوچھتے کیا ہو ان آنکھوں کی اداسی کا سبب
خواب جو دیکھے وہ خوابوں کی حقیقت مانگے

خلیل الرحمن اعظمی

رات کا زہر بجھاتے رہے بینائی میں
چھپ کے بیٹھی رہی تصویر تماشائی میں

دیکھنے آتا بھی ہے چھوڑے ہوئے اس شہر کو
یعنی اس کے بعد، کیا اجڑا ہے کتنا رہ گیا

دیکھتے دیکھتے ویراں ہوئے منظر کتنے
اڑ گئے بام تمنا سے کبوتر کتنے

ظفر اقبال

جب دہر کے غم سے اماں ملی ہم لوگوں نے عشق ایجاد کیا
کبھی شہر بتاں میں خراب پھرے کبھی دشت جنوں آباد کیا

گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں، من میں کیا کیا موسم ہیں
اس بگیا کے بھید نہ کھولو، سیر کرو خاموش رہو

جی بہلتا ہی نہیں اب کوئی ساعت کوئی پل
رات ڈھلتی ہی نہیں چار پہر سے پہلے

ابن انشاء

عکس کو قید کہ پرچھائیں کو زنجیر کریں
ساعتِ ہجر تجھے کیسے جہاں گیر کریں

بہت دنوں سے گزرگاہِ خواب سونی ہے
سرائے شام یہاں اور میں رکوں کب تک

نکلا تھا میں صدائے جرس کی تلاش میں
دھوکے سے اس سکوت کے صحرا میں آگیا

شہریار

نہ جانے کل ہوں کہاں ساتھ اب ہوا کے ہیں
کہ ہم پرندے مقاماتِ گم شدہ کے ہیں

اکیلا اپنا محرم کہ اپنا دوسرا میں
نظر میں، آئینہ میں، ساعت میں، صدا میں

اے صفِ ابرِ رواں تیرے بعد
اک گھنا سایہ شجر سے نکلا

باقی

میں تشنہ تھا مجھے سر چشمۂ سراب دیا
تھکے بدن کو مرے پتھروں میں داب دیا

سوادِ رفتہ سے فردائے بے نہاد تلک
گھسیٹے پھرتا ہے میری طلب کا جال مجھے

خاکسترِ جاں کو میری مہکائے تھا لیکن
جو ہی کا وہ پودا میرے آنگن میں نہیں تھا

زیبؔ غوری

اجاڑ گھر کے کسی بے صدا دریچے میں
کوئی چراغ جلے بھی تو کون دیکھتا ہے؟

تیرے ہنر میں خلقتِ خوشبو سہی مگر
کانٹوں کو عمر بھر کی چبھن کوئی دے گیا؟

فاختہ، تند بگولوں میں گھری ہے محسنؔ
کون اب اس کو ہرے پیڑ کی ڈالی دے گا؟

محسنؔ نقوی

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا
عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا

بکھر چکے ہیں بہت باغ و دشت و دریا میں
اب اپنے حجرۂ جاں میں سمٹ کے دیکھتے ہیں

فریب کھا کے بھی اک منزلِ قرار میں ہیں
وہ اہلِ ہجر کہ آسیبِ اعتبار میں ہیں

افتخارؔ عارف

اٹھو یہ منظرِ شب تاب دیکھنے کے لئے
کہ نیند شرط نہیں خواب دیکھنے کے لئے

غبار تیرہ شبی جم گیا ہے آنکھوں میں
یہیں چراغ جلے تھے دھواں کہا جائے

میں تو ایک بادل کا ٹکڑا ہوں اڑا لے چل مجھے
تو جہاں چاہے وہاں موجِ ہوا لے چل مجھے

عرفانؔ صدیقی

لچکتے تھے سروں پر اور جسموں میں اترتے تھے
کبھی مقتل کی خوریزی میں اک تلوار تھے ہم بھی

دیکھوں گا ابھی اور بھی خنجر کی روانی
قاتل کو ابھی اور بھی سفاک کروں گا

چار طرف جو آگ لگی ہے میں نے ہی سلگائی ہے
اٹھتا ہے جو سب کے گھروں سے یہ میرے ہی گھر کا دھواں ہے

انیسؔ اشفاق

جب دیکھتا ہوں ڈھلتی ہوئی شام کی طرف
جاتا ہے دھیان گھر کے درو بام کی طرف

کوزہ گر نے ہمیں مٹی سے کیا تھا تخلیق
کیا تعجب ہے اگر خاک ہوئے جاتے ہیں

اداسی زہر کی صورت فراستؔ
رگ و پے میں اترتی جا رہی ہے

فراستؔ رضوی

یہ اشعار بدلتی ہوئی ادبی اور شعری صورتحال پر دال ہیں۔ ان شعروں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ نئے موضوعات ومضامین کے حامل ہیں اوران کے اندر نئے اقدار کی ترجمانی پوری طرح موجود ہے یہاں تجزیے کے ذریعہ ان کے مفاہیم کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ان کے نقل کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ بتایا جاسکے کہ کس طرح ترقی پسند شاعری کے بعد ہماری شاعری کا منظرنامہ تبدیل ہورہا تھا اور کس طرح نئے افکار واقدار ایک نئے طرز احساس کے ساتھ ہماری شاعری میں جگہ پارہے تھے۔

یہاں ہم اس نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ماقبل آزادی اردو غزل کی صورتحال خاصی تشویش ناک ہوگئی تھی جدید نظم کے عروج اور ہیئت اور تکنیک کے تجربات کے باعث اکثر شعراء نے اس صنف کو دوسرے درجہ کی صنف سخن قرار دیا تھا بعض ترقی پسند شعراء نے تو اس صنف کو جاگیردارانہ تہذیب کی علامت قرار دے کر علی الاعلان مخالفت شروع کردی تھی۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے نظم منتہائے کمال پر تھی اور غزل ایک طرح سے مائل بہ زوال ہورہی تھی، پاکستان میں ۱۹۶۰ء اور ہندوستان میں ۱۹۶۵ء کے بعد غزل کو ایک بار پھر غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور نئی شاعری میں غزل اک نمایاں اور لائق احترام صنف سخن قرار پائی۔ غزل کے احیاء یا تخلیق کاروں کی غزل کی طرف مراجعت کو ایک ادبی معجزہ سمجھنا چاہئے چنانچہ ایک مقام پر ڈاکٹر وزیر آغا رقم طراز ہیں:

> ''تقسیم کے بعد غزل کا حیرت انگیز اور مسرت آفریں واقعہ اس لئے نمودار نہیں ہوا کہ نظم کا دور ختم ہوگیا تھا بلکہ اس لئے کہ بحیثیت مجموعی حالات میں فرد کے ذاتی رجحانات، ملک کے اجتماعی رجحانات میں ضم ہوکر رہ گئے تھے اور غزل کو چونکہ ہمیشہ سے اجتماعی کیفیات وتاثرات کو ایجاز واختصار کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھالنے کی قدرت حاصل رہی ہے لہٰذا اس موقع پر اک بالکل نئے اور تازہ انداز کے ساتھ ابھری اور بساط ادب پر چھاگئی چنانچہ اس میں پرانے غزل گو شعراء کے علاوہ نہ صرف ہمارے اچھے نظم گو شعراء نے بھی خود کو غزل کی طرف مائل پایا بلکہ بہت سے نئے لکھنے والے بھی اس کارواں میں شامل ہوگئے''۔

غزل کے احیاء اور اسے مقبول بنانے میں ہمارے جدید شاعروں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ان کا ذہنی و علمی پس منظر اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں خاصا وسیع تھا اور ان کے یہاں روایت کا بھی گہرا شعور تھا۔ روایت کے شعور کو ٹی ایس ایلیٹ نے ایک ایسی لازمی شے قرار دیا ہے کہ جس کے حصول کے لئے ہر ممکنہ کوشش کرتے رہنا چاہئے اور زندگی کی آخری سانس تک اس کی آبیاری بھی کرنا چاہئے کیونکہ یہ بات اسے کیا تخلیق کرنا ہے بقول ایلیٹ:

> ''اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس لمحے میں زندہ نہ ہو جسے حال نہیں بلکہ ماضی کا لمحۂ موجود کہتے ہیں اور جب تک وہ نہ صرف اس کا شعور رکھتا ہو کہ کون کون سی چیزیں مردہ ہو چکی ہیں بلکہ اس کا شعور بھی رکھتا ہو کہ کیا کیا چیزیں پہلے زندہ ہیں۔'' (ایلیٹ کے مضامین، ص/۱۵۲، ترجمہ جمیل جالبی لاہور ۱۹۶۰ء)

یہ روایت کا گہرا شعور ہی تھا جس کے سبب جدید شعراء نے روایت کی پرستاری نہیں بلکہ جہاں کہیں ضروری سمجھا روایت کے بت توڑنے کی کوشش بھی کی ان کی نظر میں مغرب کے وہ تجربات بھی تھے جن میں بلا کی تازہ کاری تھی انھیں نت نئے فلسفوں اور افکار و اقدار سے بھی دلچسپی تھی جن کا جنم بیسویں صدی کی کوکھ سے ہوا تھا اور جو اس صدی کے بدلتے ہوئے انسان کی بھرپور نمائندگی کرتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ لسانی سطح پر بھی غزل میں جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں وہ غزل کے روایات کے پیش نظر خیرہ کن ہیں حتیٰ کہ اکثر شعراء نے نئی زمینیں اختراع کی ہیں اور بحر و آہنگ کے نئے تجربے کئے ہیں، نئی بحروں، نئے مضامین اور ان کے اظہار کی نوعیت میں بھی تبدیلی واقع ہوئی جن سے ایک دم نئے تجربے کا احساس ہوتا ہے۔ غزل کے مخصوص فارم میں اس قسم کی تبدیلیاں جو چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی فوری طور پر نظر آجاتی ہیں مثلاً انسانی رشتوں کے تعلق سے نئی غزل میں ایک نیا طرز احساس ہے جس میں تجربے کی نوعیت جہاں ایک طرف انفرادی اور ذاتی ہے وہاں دوسری طرف اس کا تبدیل شدہ ایک اجتماعی اور تہذیبی پس منظر بھی ہے یہ رشتہ صرف عاشق و معشوق یا مرد اور عورت کے باہمی تجربے ہی کا مظہر نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ غزل کے روایتی پیرائے میں مرد و عورت کے رشتوں اور انسان کے ساتھ دوسرے

انسان کے رشتوں کا ایک خاص پس منظر تھا۔ عاشق و معشوق اور ان کے ساتھ محتسب، ناصح اور رقیب کے کردار بھی تھے ان کے باہمی رشتوں میں ایک خاص قسم کی چشمک رہا کرتی تھی اور اس کی نوعیت بھی متعین تھی، اسی طرح انسان اور انسانی رشتوں میں اخلاقی روایات کا دباؤ شدید تھا۔ وہ قدریں جنہیں مختلف مذاہب اور تہذیبوں نے خلق کیا تھا ان میں جغرافیائی، تاریخی اور اقتصادی اعتبار سے تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں مگر بنیادی سچائی جوں کی توں قائم رہی یعنی صداقت، انس، ہمدردی، اخلاص اور رواداری جیسی اعلیٰ بشری اقدار کا اثاثہ موروثی رہا۔ اس طرح وہ اقدار جو خلاف بشریت و آدمیت تھے جیسے جھوٹ، ظلم، ناانصافی، قتل، غارتگری، جبر، مکاری، فریب اور انتقام کا بھی بول بالا رہا نیز نئی مشینی اور صنعتی تہذیب کے دباؤ کے ماتحت اخلاقی اقدار میں زبردست تبدیلیاں پیدا ہوئیں بقول مائیکل رابرٹس:

> ''سائنس کی ترقی نے اور صنعتی تبدیلیوں نے اس کلچر کو بالکل تباہ کردیا ہے جو زرعی بنیادوں پر قائم تھا جیسے جیسے تعلیم و تدریس کی بنیاد زیادہ سے زیادہ سائنٹفک ہوتی گئی ویسے ویسے قدیم مذہبی اور اخلاقی آدرشوں کا زوال بھی ہوتا گیا۔ مذہب اور کلاسیکس سے ہمیں اساطیری داستانوں کا جو ذخیرہ مل جاتا تھا وہ سماجی مقاصد اور سماج میں فرد کے فرائض کی نشان دہی کرتا تھا اب وہ سرچشمہ بھی خشک ہوگیا ہے اس سے جو بدحالی اور افراتفری پیدا ہوئی ہے اس نے سنجیدہ اور ذمہ دار شاعر کو متفکر و پریشان کردیا ہے خواہ وہ دنیا کے کسی حصے کا کیوں نہ ہو''۔

(ماہنامہ ''کتاب'' سالنامہ ۱۹۶۷ء، ص ۱۲۱ لکھنؤ)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے ربع اول سے ہی خارج کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کی بنا پر ہمارے محسوسات و خیالات بھی تبدیل ہونے لگے تھے۔ عرض کیا جا چکا ہے انجمن پنجاب کی بنیاد اس لئے پڑی تھی کہ شاعری کو تبدیل ہوتی ہوئی نئی دنیا کا ترجمان بنایا جاسکے اور اسے غزل کے عشقیہ موضوعات کے دائرہ سے باہر نکالا جاسکے۔ ترقی پسند تحریک تک آتے آتے مسائل کی دنیا بہت تیزی سے تبدیل ہو چکی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں رونما ہونے والے واقعات نے انسانی ذہن پر گہرے اثرات مرتب کئے

تھے۔دوسری طرف استحصالی قوتوں کے زور پکڑنے کی بنا پر طبقاتی کشمکش بڑھتی جارہی تھی اور ظلم اور ناانصافیوں کا بول بالا ہوتا جارہا تھا یہ صورت حال ادیبوں اور قلمکاروں کے لئے تشویش کا باعث تھی اور اس سے نبرد آزما ہونے کے لئے ضروری تھا کہ ان منفی قوتوں کے خلاف ادبی سطح پر بھی آواز بلند کی جائے چنانچہ ترقی پسند تحریک کا قیام عمل میں آیا۔اس تحریک کے قیام کے زمانے میں علوم کی دنیا بھی بڑی حد تک روشن ہو چکی تھی،جس کی بنا پر ہمیں ان مسائل کے سیاسی،سماجی،اور فلسفیانہ اسباب کو پرکھنے کا شعور ملا اور ترقی پسند ادیبوں نے ایک مخصوص سماجی فلسفے کو ان مسائل سے نپٹنے کے لئے ضروری جانا۔یہیں سے ہماری شعری اور ادبی دنیا ایک بار پھر تبدیل ہونے لگی اور ربع اول میں نمودار ہونے والے مسائل ہماری شاعری کا محور و مرکز بن گئے اس شاعری سے متعلق موضوعات و مضامین کا ذکر کیا جا چکا ہے۔پچاس سے قبل تک ہماری شاعری میں یہی موضوعات و مضامین (ظلم،عدم مساوات،استحصال،طبقاتی کشمکش وغیرہ) گردش کرتے رہے لیکن چالیس کے دہے میں ایک بار پھر ملکی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے بعض واقعات نے مسائل کی دنیا کو بدل دیا لیکن اس بار یہ تبدیلی خارجی کے بجائے باطنی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ اب جو واقعات رونما ہوئے تھے انھوں نے انسان کو نئی ذہنی کیفیتوں سے دوچار کیا۔جنگ کی ہولناکی،تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات نے انسان کو خارجی دنیا سے برسرپیکار ہونے کے بجائے اپنی باطنی دنیا میں سمٹ جانے پر مجبور کر دیا۔ترقی پسند تحریک کے بعد ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے جس نئی دنیا کا خواب دیکھا تھا وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور اس طرح وہ سماجی نصب العین جسے اپنے عہد کے مسائل سے نجات کا وسیلہ بنایا گیا تھا کارگر ثابت نہیں ہوا پھر یہ کہ اب مسائل کی وہ نوعیت بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ایک نئے اور آزادانہ نظام میں جس طرح واقعات نے کروٹ لی تھی اس کے لئے آزاد ہندوستان کے باشعور لوگ تیار نہیں تھے۔توقع کے بر خلاف رونما ہونے والے ان واقعات نے انسان کو ایک نئے طرح کے آزار میں مبتلا کر دیا تھا وہ اب خود کو تنہا،بے سہارا اور مصیبت کا مارا محسوس کرنے لگا۔یہ انسان مستقبل سے مایوس ہو گیا اور اس میں بے یقینی،لا حاصلی،رائگانی اور عدم حوصلہ کا احساس پیدا ہونے لگا ان ذہنی

کیفیتوں کی بنا پر زندگی پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا اور وہ اپنے سفر کو ظلمتوں کے سفر سے تعبیر کرنے لگا۔ یہ احساسات اس عہد کی صورت حال کے نفسیاتی ردعمل کے طور پر پیدا ہوئے تھے اور پچاس کے بعد کے شاعروں نے انہیں احساسات کی ترجمانی کو اپنی شاعری کا مقصد قرار دیا چنانچہ پچاس کے بعد کی شاعری انہیں محسوسات کی ترجمان ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مسائل کی اس نئی دنیا کی ترجمانی کے پس پشت ایک نیا طرز احساس کار فرما تھا اسی لئے پچاس کے بعد کی شاعری کو نئے طرز احساس کی شاعری کہا جاتا ہے ابتداءً جن شاعروں نے ان احساسات کی بنا پر اپنی پہچان بنائی ان میں ناصرؔ کاظمی، احمد مشتاقؔ، منیرؔ نیازی، خلیل الرحمنؔ اعظمی، ظفرؔ اقبال، ابن انشاءؔ، شہریارؔ، بانیؔ، زیبؔ غوری، محسنؔ نقوی، افتخار عارف، عرفانؔ صدیقی، انیسؔ اشفاق، فراستؔ رضوی کے نام نمایاں ہیں۔ ان تمام شعراء کے کلام میں ہم ان محسوسات کی بازگشت کو صاف طور پر سن سکتے ہیں۔ پچاس کے بعد کی شاعری انہی محسوسات وخیالات اور افکار واقدار سے عبارت ہے۔

●●●

غزل کے نئے موضوعات و اسالیب

قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک اردو شاعری کی تاریخ شاہد ہے کہ بنیادی روایات اور عصری تغیرات کا جتنا حسین امتزاج غزل میں پایا جاتا ہے اتنا اردو کی کسی صنف سخن میں نظر نہیں آتا در اصل اسی امتزاج میں غزل کا حسن مضمر ہے۔ ایمان کی حد تک روایت پرستی اور ارتداد کی حد تک روایت شکنی، کورانہ تقلید اور باغیانہ انقطاع دونوں ہی اس کے ارتقا میں مانع ہیں ہر چند کہ روایت کی بھی اپنی اہمیت و معنویت ہے اگر یہ متوازن ہو تو معنی و مفاہیم کے نئے نئے جہات روشن ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ ایک مقام پر پروفیسر شمیم حنفی نے تحریر کیا ہے:

> ''روایت کی حیثیت فن اور فکر کے ارتقاء میں اساسی ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے قطع نظر زندہ اور فعال حقیقتوں سے مملو روایت بیک وقت آئندہ حقیقتوں کی محرک اور اس کے امتحان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ وہ ماضی اور حال دونوں زمانوں میں ایک ساتھ زندہ رہتی ہے اور وقت سے اس کا رشتہ محض ایک تاریخی واقعہ یا پس منظر کی شکل میں نہیں استوار ہوتا بلکہ ارتقاء پذیر میلانات کے ساتھ اس کے وجود اور معنویت کا احساس اور زیادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔'' (سہ ماہی ''شعر و حکمت'' شمارہ نمبر ۲، ص ۲۰ حیدر آباد)

روایت کا تعلق جہاں ایک طرف ماضی سے ہے وہیں حال سے بھی مربوط ہے۔ روایت چونکہ ایک زندہ اور فعال تسلسل سے عبارت ہے اس لئے اس میں تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو کا تصور بھی پوشیدہ ہے یہی سبب ہے کہ غزل نے جب بھی اپنی روایت کی حدود میں

رہتے ہوئے عصری تبدیلیوں اور نئے رجحانات کو قبول کیا ہے وہ پہلے سے زیادہ بامعنی اور پرقوت ہو کر سامنے آئی ہے۔ خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے ہر زمانے کا ساتھ دینے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق خود کو ڈھال لینے کی حیرت انگیز صلاحیت غزل میں پائی جاتی ہے۔ اردو شاعری کی دوسری کوئی صنف غزل کی اس غیر معمولی خوبی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

غزل نے اگرچہ ہر دور میں اپنے انداز و اسلوب کو تبدیل کیا ہے لیکن ۱۹۴۷ء سے پہلے کی غزل میں مجموعی طور پر ایسی نمایاں تبدیلیاں نظر نہیں آتیں جن کی بدولت اس دور کی غزل کو ادوار ماقبل کی غزل سے مختلف قرار دیا جا سکے۔ البتہ ۱۹۴۷ء کے بعد بالخصوص ۱۹۶۰ء کے مابعد کی غزل میں ایک بالکل نئی اور انقلابی فضا نظر آتی ہے۔ آج کی غزل اپنے مزاج ومنہاج، رنگ و آہنگ، لب ولہجے، انداز و اسلوب، موضوعات ومضامین، غرض کہ ہر اعتبار سے پہلے کی غزل سے مختلف ہے۔

نئی غزل ترقی پسند شاعری کی طرح عقائد وفرائض کو شاعری پر افضلیت وفوقیت نہیں دیتی۔ اس کی نظر میں شاعری انسان کے جذبات واحساسات کا اظہار ہے نہ کہ سماج اور سیاست کا آلۂ کار۔ کلچر، مذہب، اخلاق، قانون، سیاسی اور سماجی نظام، انسان نے اپنے لئے بنائے ہیں نہ کہ انسان ان کے لئے بنا، بیان کیا جا چکا ہے کہ ترقی پسند شاعری ایک مخصوص اور محدود سیاسی مسلک سے بری طرح مشروط تھی اس کے لئے اس کی مخصوص مقصدیت ہر شے حتیٰ کہ انسان سے بھی افضل تھی۔ اس میں نظریاتی اعتبار سے ایک مذہبی کٹر پن پیدا ہو گیا تھا لیکن حقیقت اور معقولیت کی تعریف کے جملہ حقوق ایک مخصوص سیاسی جماعت کے نام محفوظ کر دیئے تھے، زبان وبیان، اسالیب وتکنیک اور فارم کے ضمن میں ترقی پسند شعراء نے نئی راہیں نکالیں تھیں لیکن تمام راہیں صرف ایک ہی منزل مقصود کی طرف مڑتی تھیں۔ نئی غزل ہر قسم کے جبر واستحصال کے خلاف ہے اس کا کینوس بہت وسیع اور اس کے تجربات ہمہ گیر ہیں، نئی غزل اس لئے نئی نہیں ہے کہ وہ تاریخی اعتبار سے نئے زمانے کی پیداوار ہے بلکہ وہ اس لئے نئی ہے کہ ظاہر وباطن، احساس واظہار، فکر وفن دونوں اعتبار سے آج کے عہد کی چیز ہے جہاں تک موضوعات

ومضامین کا تعلق ہے تو نئی غزل میں پرانے موضوعات بھی پائے جاتے ہیں، اور نئے مضامین بھی، جو چیز غزل کو نیا بناتی ہے اور پرانے موضوعات کو بھی نیا بنا کر پیش کرتی ہے وہ نئے شعراء کے سوچنے کا ڈھنگ، اشیاء واقدار کی جانب ان کا رویہ اور موضوعات کی ندرت ہے۔ نئی غزل کے شاعر کا طرز احساس بھی نیا ہے اور طرز اظہار بھی، یہی وجہ ہے کہ وہ پرانی باتیں بھی کہتا ہے تو نئی معلوم ہوتی ہیں، مثال کے طور پر عشق کو لے لیجئے جو غزل کا بنیادی موضوع ہے اور جس کی کارفرمائی ہر زمانے میں رہی ہے لیکن آج کی غزل کے عشقیہ اقدار پہلے کی غزل سے بالکل مختلف ہیں۔ آج اس میں وہ ماورائیت، روحانیت اور رومانیت نظر نہیں آتی جو پہلے کی غزل کے عشق کا طرۂ امتیاز تھی نئی غزل کے عشق کی پہچان ارضیت، مادیت اور واقفیت ہے جو آج کے معاشرتی حالات اور تہذیبی عوامل کی دین ہے اس قبیل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

فکر یہ تھی کہ شب ہجر کٹے گی کیوں کر
لطف یہ ہے کہ ہمیں یاد نہ آیا کوئی

ناصؔر کاظمی

میں نے کہا کہ دیکھ! یہ میں، یہ فضا، یہ رات
اس نے کہا کہ میری پڑھائی کا وقت ہے

احمد مشتاؔق

پہلے یہ شوق ستاتا تھا کہ ان سے ملئے
اب یہ احساس رلاتا ہے کہ بیکار ملے

ظفؔر اقبال

یہ لڑکی تو ان گلیوں میں روز ہی گھوما کرتی تھی
اس سے ان کو ملنا تھا تو اس کے لاکھ بہانے تھے

ابن انشاؔء

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمہیں بھلا دیتے
خلیل الرحمن اعظمی

اس سے بچھڑتے وقت میں رویا تھا خوب سا
یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا
محمد علوی

اک بکھرتی ہوئی ترتیب بدن ہو تم بھی
راکھ ہوتے ہوئے منظر کے سوا میں کیا ہوں
بانی

پہلے تو میری یاد سے آئی انہیں حیا
پھر آئینے میں چوم لیا اپنے آپ کو
شکیب جلالی

کیوں آج اس کا ذکر مجھے خوش نہ آسکا
کیوں آج اس کا ذکر مرا دل دکھا گیا
شہریار

بچھڑے تو عجب پیار جتاتا ہے خطوں میں
مل جائے تو پھر حد سے گزرنے نہیں دیتا
محسن نقوی

تم تو سچے ہو مگر دل کا بھروسہ کچھ نہیں
بجھ نہ جائے یہ چراغ انتظار اگلے برس
عرفان صدیقی

اک عالم خوبی ہے میسر مگر اے کاش
اس گل کا علاقہ مری جاگیر میں ہوتا

افتخار عارف

ترے لمس کے مہتابوں سے مرے جسم کی وادی روشن
کل تک جو تاریک پڑا تھا اب وہ قریہ نور فشاں ہے

انیس اشفاق

بہت انکار کرتا ہے سوال وصل پر لیکن
خفا ہو جاؤں تو گردن میں باہیں ڈال دیتا ہے

فراست رضوی

میری بانہوں میں بہکنے کی سزا بھی سن لے
اب بہت دیر میں آزاد کروں گا تجھ کو

جون ایلیا

وہ مری روح کی الجھن کا سبب جانتا تھا
جسم کی پیاس بجھانے پہ بھی راضی نکلا

ساقی فاروقی

تری خوشی نے مرا حوصلہ نہیں دیکھا
ارے میں تیری محبت سے بھی مکر جاتا

شاذ تمکنت

سڑک پہ چلتے ہوئے آنکھیں بند رکھتا ہوں
ترے جمال کا ایسا مزا پڑا ہے مجھے

آشفتہ چنگیزی

کل رات بہت گریۂ پیہم نے ستایا
یوں روئے کہ رونے کا سبب یاد نہ آیا

اطہر نفیس

روشنی اس کے خیالوں میں کچھ ایسی ہے کہ بس
دھیان آئے تو ہر اک راہ منور دیکھوں

مہتاب حیدر نقوی

آج کی رات کوئی چاند، نہ چہرہ، نہ چراغ
آج کی رات مجھے پھر ہے ضرورت تیری

فرحت احساس

کوئی چہرہ اب کسی کھڑکی میں یاد آتا نہیں
ساحلوں پر دھوپ لیتی لڑکیاں ہیں اور ہم

اشفاق حسین

دیکھ کر جس شخص کو ہنسنا بہت
سر کو اس کے سامنے ڈھکنا بہت

کشور ناہید

ہیں فون پر کس کے ساتھ باتیں
اور ذہن کہاں بھٹک رہا ہے

پروین شاکر

بدن کے لمس میں بجتی سی جل ترنگ سنیں
لہو کی بوند میں رقصِ شرر کو یاد کریں

زاہدہ زیدی

گذشتہ صفحات میں عرض کیا جا چکا ہے کہ کیفیات حسن و عشق کا اظہار غزل میں ازمنۂ قدیم سے ہوتا رہا ہے مگر نئی غزل نے اس کے کینوس کو وسیع کر کے اس کی معنویت وافادیت کو خاصا بڑھا دیا ہے۔ اس کے علاوہ نئی غزل کے اہم موضوعات میں فرقہ وارانہ فسادات، سماجی ظلم اور ناانصافی، کربلا، ہجرت، کرب ذات اور انکشاف ذات، خوف، دہشت، حزن و ملال، محرومی و ناکامی، بے ضمیری، بے یقینی، نا آسودگی، عدم حوصلہ، عدم استحکام، خوف مرگ، لایعنیت، تنہائی وغیرہ ہیں۔ نئی غزل درحقیقت معاصر انسان کی خارجی اور داخلی شکست وریخت کا اظہار ہے نئی غزل کی تفہیم کے لئے اس عہد کے انسان اور اس کے مسائل سے واقفیت ضروری ہے، مشینی زندگی، نیچر سے انسان کی ازلی وابستگی کے خاتمے، خدا کے تصور کے زوال نیز تمام اقدار کے مٹ جانے سے نیا انسان جن مسائل سے دوچار ہے اور نئے اقدار کی تلاش میں جس تخلیقی کرب سے گزر رہا ہے وہ خودرحمی کی سرحدوں کو چھو چکا ہے آج کا انسان ماقبل کے انسان سے ذہنی طور پر مختلف ہے وہ اب زمینی فاصلوں کے کم یا ختم ہو جانے سے بین الاقوامی سطح پر ایک عالمگیر قوم میں شامل ہو گیا ہے اس کا کرب اب محدود نوعیت کا نہیں رہا جبکہ پوری کائنات کے اسرار کی گرہیں کھل چکی ہیں اس کے کرب کی شدت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ نیا انسان خارجی وسعتوں کے سامنے خود کو ہیچ پا کر اب اپنے وجود کو تلاش کرنے نکلا ہے اس کا سفر اب اپنے خارج سے باطن کی طرف ہے اس لئے وہ خود سے ہم کلام ہے سوالات نئے اور پیچیدہ ہیں وہ ان سب کا جواب چاہتا ہے۔ اضطراب گہرا اور شدید ہے اس کی آواز میں زوال خوردہ معاشرے کی چیخیں شامل ہیں جو ہمیں نئی غزل میں صاف طور پر سنائی دیتی ہیں۔

عرض کیا جا چکا ہے کہ آج انسان وجودی انتشار و بحران کے نرغے میں ہے وہ خدا، فطرت، معاشرے، افراد اور خود اپنی ذات سے بے تعلق اور ترسیل وابلاغ سے محروم ہے، دکھ درد، خوف و دہشت اور اجنبیت اور بیگانگی کے احساسات اس کا مقدر ہیں، کلاسیکی ادب میں تنہائی کا احساس مرکزیت نہیں رکھتا تھا وہاں عذاب تنہائی سے نجات کی راہ بھی کھلی ہوئی تھی، خدا کی طرف واپسی اور گم شدہ اصول و اقدار، زندگی کی جستجو، کرب تنہائی سے

نجات کی مثبت صورت تھی روایتی سماج میں سارا زور اخلاقی اور روحانی قدروں کی سالمیت پر دیا گیا تھا کہ عذاب تنہائی سے انسان کے تحفظ کا راستہ وہیں سے نکلتا ہے وہاں تنہائی جزوی صداقت کی حیثیت رکھتی تھی اس کے برعکس میکانیکی سماج اور مشینی معاشرے میں تنہائی ایک جزوی نہیں بلکہ کلی صداقت ہے۔ عصری معاشرہ تنہا اکائیوں کی ایک بھیڑ ہے بہت قریب رہ کر بھی ایک دوسرے سے دوری کا احساس ہوتا ہے داخلیت کی گہرائیوں میں نادیدہ مسافت حائل ہے باہمی گفتگو بھی ترسیل کی ناکامی کا المیہ ہے۔

داخلی ارتقاء کے اولین مرحلوں میں تنہائی کا احساس، درد وغم، خوف ودہشت، اضطراب وانتشار، عارضیت وثباتیت، محرومی وناامیدی وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے نئی غزل میں ایسے احساسات وسیع پیمانے پر شعری تجربے کا حصہ بنے ہیں مثلاً:

یونہی اداس رہا میں تو دیکھنا اک دن
تمام شہر میں تنہائیاں بچھا دوں گا

ناصر کاظمی

رات پھر وہی بات ہوئی ہم کو نیند نہیں آئی
اپنی روح کے سناٹے سے شور کوئی اٹھتا دیکھا

خلیل الرحمٰن اعظمی

ہر طرف خاموش گلیاں زرد رو گونگے مکیں
اجڑے اجڑے بام و در اور سونے سونے شہ نشیں

منیر نیازی

گم سم کھڑے ہیں اونچی فصیلوں کے کنگرے
کوئی صدا نہیں، مجھے کس نے پکارا تھا

مجید امجد

وہ بے بسی ہے کہ دل کو یقیں نہیں آتا
مکاں پکار رہا ہے مکیں نہیں آتا

ظفر اقبال

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو!
تا حد نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

شہریار

جہاں تلک بھی یہ صحرا دکھائی دیتا ہے
مری طرح سے اکیلا دکھائی دیتا ہے

شکیب جلالی

سارے مکاں لا مکاں خالی و بے نقش تھے
برق خلا میں نہ تھی سانپ کھنڈر میں نہ تھا

باقی

کوئی بھی گھر میں سمجھتا نہ تھا مرا دکھ سکھ
اک اجنبی کی طرح خود میں اپنے گھر میں رہا

محمد علوی

خواب کی طرح بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
ایسی تنہائی کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

افتخار عارف

مجھ میں رقصاں کوئی آسیب ہے آوازوں کا
میں کسی اجڑے ہوئے شہر کا سناٹا ہوں

عرفان صدیقی

دل میں تنہائی کا سناٹا عذاب حشر ہے
رات بھر بجتی ہیں میرے گھر کی ساری کھڑکیاں

محسنؔ نقوی

دستک پہ اب گھروں سے کوئی بولتا نہیں
پہلے یہ شہر ، شہرِ عدم رفتگاں نہ تھا

انیسؔ اشفاق

گم ہوئے ایسے کہ آتا ہی نہیں کوئی جواب
نام لے لے کے بہت ہم نے پکارا اپنا

فراستؔ رضوی

اس شور کے باوجود ، دن بھر
کرتا ہے یہ شہر سائیں ، سائیں

سلیم احمد

اے شہر بتا کہاں گیا میں
مجھ کو مری یاد آ رہی ہے

فرحتؔ احساس

رفیق و یار کہاں اے حجابِ تنہائی
بس اپنے چہرے کو تکتا ہوں آئینہ رکھ کے

محمود ایازؔ

روح کے دشت میں اک ہو کا سماں ہے اے شاذؔ
دے گیا کون بھرے شہر میں بن باس مجھے

شاذؔ تمکنت

عجیب دشت سفر ہے نہ روشنی نہ ہوا
کہاں پہ ہوں مرا پیکر کہیں دکھا مجھ کو

کمار پاشی

جاتا نہیں کناروں سے آگے کسی کا دھیان
کب سے پکارتا ہوں یہاں ہوں یہاں ہوں میں

عمیق حنفی

اب ٹوٹنے ہی والا ہے تنہائی کا حصار
اک شخص چیختا ہے سمندر کے آر پار

عادل منصوری

دل کو پتھر ہی سے ٹکراؤ کہ آواز تو ہو
خامشی مرگ جنوں ، مرگ وفا ہے یارو!

منظر سلیم

آنکھوں میں اترا ہے بام و در کا سناٹا
میرے دل پہ چھایا ہے میرے گھر کا سناٹا

پروین شاکر

یہ راہ سخت یہ دشت الم کی پنہائی
قدم قدم پہ ہمیں ڈس رہی ہے تنہائی

زاہدہ زیدی

اسے بھی اب کے بہت رنج نا رسائی ہے
کھڑی ہے شہر کی سرحد کے پاس تنہائی

مہتاب حیدر نقوی

ان تمام اشعار کے بالاستعاب مطالعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ احساس تنہائی کے نتیجے میں نئی غزل میں مہملیت و بے معنویت ،خوف ودہشت ، مایوسی ونا امیدی ،دکھ درد، اجنبیت وبیگانگی، الجھن اوراکتاہٹ وغیرہ کے رجحانات عام ہوئے ہیں اوران سے متعلق دوسرے متعدد میلانات کا سرچشمہ بھی یہی احساس تنہائی ہے جو دراصل میکانکی سماج اور مشینی تمدن کا عطیہ ہے اور جدید شاعر کا المیہ یہ ہے کہ وہ اس ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کے موسم میں سانس لینے پر مجبور ہے۔ شہر در شہر کی صورت اختیار کرتی ہوئی صنعتی وتجارتی آبادیوں میں اب اس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے وہ دیواروں کے درمیان اور چھتوں کے نیچے گھر کے سے ماحول میں ایک بے حد کم وسعت پناہ گاہ میں رہ رہا ہے جہاں اس کا اپنا کوئی نہیں، اس کے لئے کچھ رشتے اور کچھ رشتے دار تو ہیں لیکن اپنے پن کا احساس ختم ہو چکا ہے، نئی غزل میں وطن اب کوئی علامت نہیں اس کی جگہ وطن میں بے وطنی نے لے لی ہے۔ ''ناسٹلجیا'' اب اس کی یادوں کے دریچوں میں سجا ہوا کوئی جذبہ نہیں وہ گاؤں اور قصبہ سے شہر اور شہر سے دوسرے ملک میں چلا آیا تو اب گاؤں یا قصبے کی طرف مراجعت کے کوئی معنی نہیں خاندان ٹوٹ رہے ہیں جیسے کاروباری رشتوں اور طلب منفعت کی خواہشوں کے سوا یہاں کسی کا کوئی رشتہ نہیں، اب دیواریں گھروں کی تقسیم کی علامتیں ہیں، وطن کی اب کسی کو یاد ہے تو ذہنی الجھنوں کے حوالے سے جہاں رشتے تقسیم ہو چکے ہیں، قربتیں فاصلوں میں تبدیل ہو چکی ہیں، عصری زندگی کی ان پریشانیوں الجھنوں، بے چینیوں، بے یقینوں کو نئی غزل میں نہایت موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے چند اشعار اس قبیل کے ملاحظہ فرمائیں:

اجنبی شہر ، لوگ نامانوس
کیا سنے کوئی ، کیا کہے کوئی
ناصر کاظمی

رشتے ناطے کچے دھاگے تیز ہوا سے ٹوٹ گئے
تنہائی وہ صحرا جس کا ہر کوئی زندانی ہے
خلیل الرحمن اعظمی

سب پھول دروازوں میں تھے سب رنگ آوازوں میں تھے
اک شہر دیکھا تھا کبھی اس شہر کی کیا بات تھی

احمد مشتاق

دیکھنے آتا کبھی چھوڑے ہوئے اس شہر کو
یعنی اس کے بعد کیا اجڑا ہے کتنا رہ گیا

ظفر اقبال

کیا کہیے کہ اب اس کی صدا تک نہیں آتی
اونچی ہوں فصیلیں تو ہوا تک نہیں آتی

ساقی فاروقی

نہ جانے کل ہوں کہاں ساتھ اب ہوا کے ہیں
کہ ہم پرندے مقامات گم شدہ کے ہیں

بانی

جگمگاہٹ سے پروں کی کچھ چمک اٹھی تھی شام
پھر گھنا پیپل اسی ظلمت میں ڈوبا جا رہا

زیب غوری

میں وہ آدم گزیدہ ہوں جو تنہائی کے صحرا میں
خود اپنی چاپ سن کر لرزہ بر اندام ہو جائے

شکیب جلالی

وہ کون تھا وہ کہاں کا تھا کیا ہوا تھا اسے
سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو!

شہریار

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا
عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا

افتخار عارف

میں اپنی کھوئی ہوئی بستیوں کو پہچانوں
اگر نصیب ہو سیرِ جہانِ گمشدگاں

عرفان صدیقی

یہ اور کس کی صدا گونجتی ہے صحرا میں
مرے سوا بھی کوئی دشت ہُو میں رہتا ہے

انیس اشفاق

ہے اس بستی میں اک ہنگامۂ زر
کوئی اس شور میں کس کو پکارے

فراست رضوی

یہ فلک شگاف عمارتیں مرے آب وگل سے بچھڑ گئیں
مرے آب وگل پہ کرم نہ کر تو عمارتوں کو زوال دے

فرحت احساس

سکوں ملتا ہے بے آنگن گھروں میں میرے بچوں کو
کھلے دالان کی خواہش تو میری نسل ہی تک ہے

اشفاق حسین

کسی اعلیٰ روایت کی بنفشی دھند میں گم
ابھی کچھ شہر اس گہری ندی کے پار ہونگے

غلام حسین ساجد

اس شہر خوش جمال کو کس کی لگی ہے آہ
کس دل زدہ کا گریۂ خوناب لے گیا
پروین شاکر

اجڑا تو نہیں دل کا نگر آج بھی لیکن
رہتے تھے جہاں خواب وہاں زخم بسے ہیں
منظر سلیم

دشت وحشت سے بھلا کرتا ہے آنکھیں چار کون
شہر بڑھتے جا رہے ہیں اپنی عریانی کے ساتھ
مہتاب حیدر نقوی

مندرجہ بالا اشعار اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ نئی غزل انسانی زندگی اور اس کے ماحول کو بالکل جداگانہ انداز میں دیکھتی ہے اس میں داخلیت اور خارجیت کی حدیں نظر نہیں آتیں اور شعر میں معانی کی بیک وقت کئی سطحیں ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، ان اشعار میں قافیوں کی مدد سے روایتی مضامین وغیرہ کو لفظی الٹ پھیر کر کے دہرانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ ان میں وہی کیفیات اور واردات بیان کی گئی ہیں جن سے نئے شاعر دوچار ہو رہے ہیں۔ ہمارا مقصد اس مختصر جائزے سے منتخب اشعار کا تجزیہ اور تشریح (دہرائی باتوں کو دہرانا) نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد موجودہ دور کے غالب رجحانات ومیلانات کی نشاندہی اور ان تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرنا تھا جو نئی شاعری میں نمایاں ہوئی ہیں اس جائزے سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ نئی غزل میں موضوعات کا تنوع قابل لحاظ ہے۔نئی غزل کے اسالیب پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اردو غزل کا شعری نظام ایک عرصہ تک فارسی نظام کا تابع رہا ہے لیکن ''سبک ہندی'' کی نمائندگی کرنے والے ہندستانی شعراء کے انفرادی اور خلاقانہ تجربوں کی وجہ سے اردو غزل کا نظام فارسی نظام سے بہت مختلف ہو گیا اور اردو شاعری ایک نئے اسلوب سے دکن میں آشنا

ہوئی۔ ابتداءً دکن میں قلی قطب شاہ، ولی، سراج وغیرہ نے اور شمالی ہند میں آبرو، حاتم، فائز وغیرہ نے مقامی عناصر کو غزل میں پیش کیا اور اس کے فروغ پر زور دیا مگر فارسی نظام کے متوازی رجحانات نے ان کوششوں کو بار آور نہیں ہونے دیا اس کے بعد سودا، میر اور درد وغیرہ نے زبان کی آرائش وزیبائش پر توجہ دی اور زبان کو تراش خراش کے اصلاح زبان کے اصول وقواعد بنائے۔ اس کے بعد غزل کے شعری نظام میں غالب تک کوئی بہت زیادہ تبدیلی نہیں نظر آتی، موضوعاتی واسلوبیاتی سطح پر بہت معمولی تبدیلی انشاء و مصحفی کے دور میں ہوئی اور لکھنؤ میں آتش و ناسخ نے زبان کی صفائی اور درستی پر بہت زیادہ زور دیا اور خصوصاً ناسخ نے لسانی اصلاحات کی باقاعدہ مہم چلائی، غزل کے روایتی شعری نظام میں تبدیلی اور توسیع کے لحاظ سے غالب اردو کے اہم شاعر ہیں، غالب نے اردو غزل کے روایتی نظام میں بہت تبدیلیاں کیں نئی تراکیب، نئی علامات وضع کیں اور پرانی علامات میں نئے مفاہیم کو پیش کیا اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ غالب نے اردو غزل کو نئے اسلوب سے آشنا کیا جس کے نتیجے میں ایک نیا شعری نظام وجود میں آیا بقول پروفیسر انیس اشفاق:

> ''غالب نے اپنے اظہارات کے لئے ایک نئی زبان تشکیل کی یہ نئی زبان ہی غالب کو پیش رو اور ہم عصر شعراء سے الگ کرتی ہے یہ نئی زبان دراصل لفظ ومعنی کے ادغام سے وجود میں آئی ہے اور کسی بھی سطح پر غالب کے یہاں یہ دونوں (لفظ ومعنی) ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے اس طرح غالب نے ایک منفرد زبان کے ساتھ ساتھ متحرک اسلوب کی تشکیل کی یہی وجہ ہے کہ جتنی متحرک معنویت غالب کے یہاں موجود ہے اتنی کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں''۔
>
> (ادب کی باتیں 'غزل کا نیا علامتی نظام'، ص ۱۲۱، لکھنؤ)

عرض کیا جا چکا ہے کہ غالب کے عہد میں غزل کے مروجہ نظام سے انحراف کا عمل شروع ہوا۔ غالب ہی کی زندگی میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا اور ۱۸۵۷ء کے غدر سے ادب میں نئے رجحانات رونما ہوئے۔ غالب نے مروجہ نظام سے انحراف کیا لیکن غزل کے لئے علامتی پیرایۂ اظہار کو برقرار رکھا اور سیاسی وسماجی مسائل کو بھی انھوں نے رمزیاتی واستعاراتی

انداز میں پیش کیا جب کہ غالبؔ کے بعد ان کے شاگرد حالیؔ اور آزادؔ نے مل کر براہ راست پیرایۂ اظہار کی بنیاد ڈالی مگر اسی دور میں اقبالؔ نے بالواسطہ پیرایۂ اظہار کی طرف توجہ کی اور اردو کے شعری نظام میں زبردست انقلاب برپا کیا، اقبالؔ نے غزل کو ایک نئے اسلوب سے متعارف کرایا۔ اقبالؔ نے اپنی غزلوں میں عشق ومحبت کی واردات اس طرح پیش کیں جس سے ہمارے ذہنوں میں یہ باور ہوگیا کہ عشق ومحبت کا تعلق صرف دل ہی سے نہیں بلکہ عقل سے بھی ہے۔ اقبالؔ سے پہلے خودی، عشق، بے خودی، عقل ودل وغیرہ علامت کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے لیکن اقبالؔ نے ان میں نئی اور وسیع معنویت پیدا کی اور بعض نئی علامتوں مثلاً ابلیس، شاہین، مردمومن، اور لالہ وغیرہ کی تخلیق کی اقبالؔ کے اسی لہجہ کو ترقی پسند شعراء نے اپنایا، وہ اقبالؔ جیسا متوازن ومعتدل انداز نہیں پیدا کر سکے جس کے نتیجے میں ترقی پسند شعراء کا احتجاج دہشت انگیزی کی شکل اختیار کر گیا اور غزلیہ شاعری میں طنز کی لے اس قدر دھیمی پڑ گئی کہ وہ ہجو کی حدود سے جا ملی چنانچہ ترقی پسند تحریک کے ردعمل میں حلقۂ ارباب ذوق وجود میں آیا جس نے بعد میں ایک ہمہ گیر تحریک کی شکل اختیار کر لی، حلقۂ ارباب ذوق کے فنکاروں کے نزدیک تجربہ، جدت اور انفرادیت کی قید صرف موضوع تک محدود نہیں تھی بلکہ طریقۂ اظہار میں بھی اس کا وجود ضروری اور مستحسن تھا اظہار سے وابستہ ہو کر تجربہ کا مفہوم یہ تھا کہ خود کو مقررہ ہیئت واسالیب میں محصور رکھنے کے بجائے نئی ہیئت اور نئے اسالیب بیان کے تجربات کئے جائیں بعد ازآں حلقۂ ارباب ذوق کے نئے اسلوبیاتی تجربے بہت کامیاب ہوئے میراجی اور ن، م، راشدؔ اس سلسلے کے بڑے اہم شاعر ہیں۔

گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ غالبؔ کے بعد حالیؔ اور حالیؔ کے بعد اقبالؔ اور اقبالؔ کے بعد ترقی پسند شعراء اور ترقی پسند شعراء کے بعد حلقۂ ارباب ذوق نے اسلوب واظہار کے بعض کامیاب تجربے کئے حلقۂ ارباب ذوق کے بعد جدید شعراء نے بھی اس میں بہت سے اضافے کئے اور اب جدید غزل ترقی پسند شعراء کے علی الرغم اپنے عہد کے مسائل کو واشگاف اور اکہرے معنی کو پیش کرنے کے بجائے اپنے پرقوت نئے

علامتی نظام کو وسیع معنویت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ دراصل جدید شاعری ترقی پسند تحریک کے بعد ذہنی کیفیات اور طرز احساس کی پیداوار ہے اس لئے اس میں قدیم علامتوں کی تکرار اور فرسودہ تلازمات کے بجائے جدید علامتیں اور لفظوں کے نئے تلازمے نظر آتے ہیں یہ الفاظ وعلامات ہمیں ہر مقام پر متحرک نظر آتے ہیں ،دن، رات، روشنی، تاریکی، سورج، چاند، شام، تنہائی، سناٹا، چراغ، دھوپ، ہوا، سایہ، پرچھائیں، درخت، برگ، شاخ، حصار، سمندر، بادباں، جزیرہ، ابر، دریچہ، گھر، کمرہ، دروازہ، دستک، سڑک، راستہ، دھند، دھواں، چہرہ، پتھر، خاک، ریت راکھ، اور اس طرح کے بہت سے الفاظ غزل میں نئی معنویت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔

غزل کی بنیادی روایت علامتی واشاراتی انداز اور اس کی معنوی تہہ داری ہے۔ نئی غزل اس سے الگ نہیں ہے اگرچہ دیر وکعبہ، ساقی ومیخانہ، موسیٰ وطور، قیس وفرہاد، قفس وآشیانہ، صیاد وگل چیں، واعظ ومحتسب اور اس طرح کی دیگر علامتوں کے استعمال نہ ہونے سے بظاہر نئی غزل روایتی غزلیہ شاعری سے کچھ علیحدہ سی معلوم ہوتی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نئے شعراء نے پرانی علامتوں کو اپنی ذہنی کیفیات کے اظہار کے لئے ناکافی سمجھ کر نئی علامات وضع کیں ہیں مثلاً خواب، رات، شہر، جنگل، صحرا، بیابان، سمندر، دریا، خرابہ، سورج، دھوپ، سایہ، گھر، کھڑکی، دالان، آنگن، شہ نشین، دروازے، شجر اور فاختہ وغیرہ علامتیں نئی غزل میں کثرت سے استعمال ہو رہی ہیں اس میں سے بعض علامتیں اس سے قبل بھی استعمال ہوتی رہی ہیں مگر نئے شعراء نے ان میں نئے علامتی مفہوم پیدا کئے ہیں۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ نئے شعراء سے کیا مراد ہے نئے شعراء سے وہ شعراء مراد ہیں جنہوں نے کلاسیکل شاعری کا بہ نظرِ غائر مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنی شاعری کے لب ولہجہ کی تعمیر میں اس کی اعلیٰ روایت سے پورا استفادہ کیا ہے جہاں شعراء کا مقصد پرانی لفظیات وعلامات سے حاصل ہو گیا ہے وہاں قدیم لفظیات وعلامات کا استعمال کیا اور جب مقصود کے اظہار میں پرانی لفظیات وعلامات نے اپنا دامن سمیٹ لیا تو نئی علامات وضع کیں، نئی شاعری میں نئی علامتوں سے مراد ایسے الفاظ ہیں جو ابھی تک علامتی مفہوم میں مستعمل نہیں تھے۔

ان معروضات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نئی غزل کا نیا پن موضوع سے کہیں زیادہ موضوع کی پیش کش کے نئے انداز کا مرہون منت ہے۔ طرز اظہار اور اسلوب بیان کی بدولت نئی غزل پہلے کی غزل سے یکسر مختلف نظر آتی ہے نئی غزل میں زبان و بیان کے نئے اور اچھوتے انداز کو اختیار کرنے کا رجحان شروع ہی سے رہا ہے۔ اس رجحان نے غزل کو ایک ایسی زبان عطا کی جس میں پہلے کی غزل کے مقابلہ میں ایک خوشگوار تازگی کا احساس ہوتا ہے ۔نئی غزل کی یہ بدلی ہوئی دنیا جدیدیت کی سب سے بڑی دین ہے۔ جدیدیت کی کچھ باتوں سے ہم اختلاف کر سکتے ہیں اہمال کی حد تک بڑھے ہوئے ابہام اور اس کی وکالت، ترسیل کے المیے کو شاعر کا مقدر قرار دینا، علامت وغیرہ کے استعمال کو مقصود بالذات سمجھنا جیسے کئی انتہا پسندانہ رویوں کو ناپسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جدیدیت کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس نے زبان اور اس کے تخلیقی استعمال کا ایک نیا شعور عطا کیا ہے اور اردو شعر و ادب کو لفظ اور اس کے استعمال کے وسیع امکانات سے روشناس کرایا ہے لیکن نئی غزل کے ابتدائی دور میں غزل کو ایک بالکل نیا رنگ و آہنگ دینے اور نئے ذائقے سے آشنا کرنے کی غرض سے زبان کو شکست و ریخت کے جس بحران کا سامنا کرنا پڑا، اس میں وہ انتہا پسندی کا بھی شکار ہوئی ایک طرف اینٹی غزل کی شکل میں سنجیدہ اور مزاحیہ کی حد فاصل ختم ہوگئی اور غزل نے ہزل کی صورت اختیار کر لی۔ دوسری طرف زبان کے تخلیقی استعمال کے نام پر لفظ کو علامت کا روپ دینے اور گنجینۂ معنی کا طلسم بنانے کی دھن میں اکثر شعراء گنجلک اور بے معنی ہو کر رہ گئے ۔چند الفاظ و علائم کو فارمولہ بنا کر غزلیں تیار کرنے کی روش کی بدولت نئی غزل خود ایک نئے انداز کی یکسانیت اور محدودیت کی روایت قائم کرتی نظر آنے لگی لیکن غزل نے جلد ہی اس بے راہ روی سے نجات حاصل کر لی آج غزل کی زبان و بیان میں ایک متوازن معتدل سنبھلی ہوئی کیفیت نظر آتی ہے اس نے راست اور بے تکلف زبان میں رمزیہ انداز پیدا کرنے کا سلیقہ سیکھ لیا اس طرح نئی غزل نے پرانی غزل کے ساتھ ایک صحت مند انداز سے رشتہ قائم کیا۔ غزل میں رمز و ایمائیت تو پہلے بھی تھی لیکن اب اس کا لہجہ زیادہ شخصی اور غیر رسمی ہو گیا ہے کیونکہ نیا

شاعر نئی حسیت کا مالک ہے۔ اس کا طرز احساس اور انداز نظر انفرادیت کا حامل ہے چونکہ وہ ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کرنا چاہتا ہے اور دیکھی ہوئی دنیا کو نئے انداز سے دیکھنا چاہتا ہے اس لئے اس کے اظہار کا اسلوب و پیرایہ بھی نیا اور بدلا ہوا ہے اور یہ بدلا ہوا انداز و اسلوب غزل کی کھر دری، بے تکلف اور غیر آرائشی زبان میں تہہ دار معانی کی ترسیل سے عبارت ہے اور یہی نئی غزل کی انفرادی اور امتیازی خوبی ہے۔

●●●

تیسرا باب

عرفاںؔ صدیقی اور نئی اردو غزل:

- عرفاںؔ صدیقی کی شاعری کا ابتدائی اسلوب
- غزل میں عرفاںؔ صدیقی کے امتیازی لہجے اور انفرادی اسلوب کا جائزہ
- عرفاںؔ صدیقی کی مخصوص لفظیات وعلامات
اور غزل میں ان کی معنویت کا جائزہ

عرفان صدیقی کی شاعری کا ابتدائی اسلوب

عرفآن صدیقی ان شاعروں میں ہیں جنہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ ہی سے اپنی طرف شاعری کے قارئین کو متوجہ کرلیا تھا''کینوس''ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے لیکن اس مجموعہ کے منظر عام پر آتے ہی ان کا نام ہماری ادبی اور شعری دنیا میں گونجنے لگا۔ ''کینوس'' کی اشاعت اس وقت ہوئی جب نئی شاعری پوری طرح اپنے قدم جما چکی تھی اور بعض نئے شاعر اپنی شناخت کو مستحکم کر چکے تھے۔''کینوس'' کی اشاعت کے وقت نئی شاعری کے خدوخال پوری طرح واضح ہو چکے تھے اور ہم نئی شاعری کے حدود سے بھی پوری طرح واقف ہو چکے تھے اور ایسے میں''کینوس'' کی شاعری کا اپنی طرف متوجہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اس شاعری میں اسلوب کی ایسی تازہ کاری اور معنی کی ایسی ندرت موجود ہے جو نئی شاعری کے مستحکم نظام میں بھی اپنی ایک الگ پہچان کا اعلان کر رہی ہے اسی انوکھے اسلوب اور اظہار بیان کے نئے انداز نے''کینوس'' کی شاعری کی صورت میں عرفآن صدیقی کو ایک قابل توجہ شاعر کے طور پر متعارف کرایا۔

''کینوس''' کی شاعری ہر چند کہ عرفآن صدیقی کے ابتدائی اسلوب کی شاعری ہے لیکن اس شاعری کو پڑھ کر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس شاعر کے یہاں شعری اسلوب کے ارتقاء کے بہت زیادہ امکانات موجود ہیں اور یہ شاعر لفظ و معنی کے انضمام کو اہم جانتا ہے اور معنی کے عمل میں لفظ کی کارفرمائی کی اہمیت سے پوری طرح واقف ہے اور آگے چل کر ہوا بھی یہی عرفآن صدیقی کا اسلوب''کینوس'' کے بعد بتدریج ترقی کے منازل طے

کرتا رہا اور ''عشق نامہ'' تک آتے آتے اس نے ایک مکمل شعری اسلوب کی شکل اختیار کر لی، آیئے! دیکھیں کہ اس پہلے شعری مجموعہ میں عرفان صدیقی کس طرح اپنے اسلوب کے آئندہ کے امکانات کو روشن کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کس طرح معنی کی دنیاؤں کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ''کینوس'' کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی کے یہاں ابتدائی مرحلے ہی میں ایک خاص لفظیاتی نظام ترتیب پانے لگتا ہے ان کے یہاں پرانا شعری نظام گل وبلبل، شمع و پروانہ وغیرہ قطعاً نہیں ملتا انھوں نے آغاز شاعری میں ہی اپنے خصوصی لفظیات کے ذخیرہ سے ایک نئے نظام کو جنم دے کر غزل کے لفظیات میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

الفاظ کے استعمال میں عرفان صدیقی ابتدا ہی سے بہت محتاط رہے ہیں اور وہ جب تک لفظوں کے رموز واسرار کو اچھی طرح نہیں سمجھ لیتے تب تک شاعری میں ان کا استعمال نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں ہم نے پرفیسر نیر مسعود سے عرفان صدیقی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کے متعلق گفتگو کی اور جب عرفان صدیقی کی مخصوص لفظیات اور اس کے ذریعے تخلیق کی ہوئی نئی معنویت کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا:

> ''یہ معاملہ ذرا نازک ہے اس میں وہ اپنے معاصرین سے بہت مختلف ہیں مگر یہ کہ ان کے تخلیقی عمل کے بارے میں کچھ بتایا نہیں جا سکتا وہ شاعر ہی بہتر جانتا ہے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ عرفان صدیقی صاحب نے اپنی غزلوں میں جو لفظ جہاں بٹھا دیا ہے اسے وہاں سے ہٹایا نہیں جا سکتا، معلوم نہیں عرفان صدیقی اس میں کتنی محنت کرتے ہوں گے ایک مرتبہ میں نے ان سے دریافت بھی کیا تھا مگر انھوں نے اس کا کوئی صاف جواب نہیں دیا، ظاہر ہے کہ آدمی اپنے تخلیقی عمل کے بارے میں کیا جواب دے سکتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ بعض بعض اشعار انہوں نے کئی کئی دن میں کہے ہوں گے۔'' (انٹرویو/ مرزا شفیق حسین شفق)

پروفیسر نیر مسعود کے اس بیان سے دو چیزیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عرفان صدیقی کو ان کے معاصرین سے جو شے ممتاز کرتی ہے وہ ان کا اسلوب ہے

دوسرے یہ کہ عرفاںؔ صدیقی الفاظ کو کافی غور خوض کرنے کے بعد اپنے اشعار میں استعمال کرتے ہیں۔ خود انہوں نے ایک انٹرویو میں پروفیسر نیّر مسعود سے فرمایا تھا کہ:

"میں ایک ایک لفظ کے استعمال پر ہفتوں سوچتا ہوں ہفتوں .... بلا مبالغہ.... یہ کوئی بہت بڑی چیز نہیں ہے کہ اور ایسا نہیں کر سکتے اور کرتے بھی ہوں گے لیکن میں اس لئے سوچتا ہوں کہ شاید میں جو کچھ سوچ رہا ہوں یا جو بات میں کہنا چاہتا ہوں اس وقت تک اپنے تمام تلازمات اور تمام رموز کے ساتھ اجاگر نہیں ہو سکتی جب تک میں لفظ کے جتنے امکان ہیں انہیں تلاش نہ کرلوں اور برت نہ سکوں اس لئے خاصی محنت اور ریاض کی ضرورت پڑتی ہے۔"

(شب خون، ص ۳۵ و ۳۶، فروری ۲۰۰۵ء، الہ آباد)

عرفاںؔ صدیقی کے اس قول کی روشنی میں ہم بآسانی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عرفاںؔ صدیقی کی شاعری لفظ و معنی کے کامل ادغام کی شاعری ہے جب ہم عرفاںؔ صدیقی کے ابتدائی دور کے کلام کو دیکھتے ہیں تو ہر نوجوان شاعر کی طرح عرفان صدیقی کا آغاز سفر بھی خالص ذاتی احساسات کی ترسیل یعنی عشقیہ کلام سے ہوتا ہے ان کے پہلے مجموعے "کینوس" کی پہلی غزل ہی زبردست عشقیہ جذبات سے لبریز ہے البتہ عرفاںؔ صدیقی نے یہ التزام ضرور رکھا ہے کہ ان کی ابتدائی غزلیں بھی متبذل کے منطقہ میں داخل نہ ہونے پائیں۔ عرفاںؔ صدیقی کے یہاں اس التزام کی کوشش ان کی ذاتی کاوش سے ان کے عہد کا وہ پرتو ہے جس میں نوآبادیاتی طبقاتی نظام اور غیر متوازن معاشی صورت حال نے ان کے دور کے ہر نوجوان کے ذہن میں ایک فرسٹریشن (Frustraion) پیدا کر دیا تھا اور جس سے عملی جنگ کی کوشش اس کے فکر و فہم سے باہر تھی۔ یہ عرصہ انیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے درمیان کا ہے جب بلوغت کی عمر کو پہنچنے والے تمام نوجوانوں کو جہاں اس بات کا احساس تھا کہ ان کے آبا و اجداد نصف صدی سے غلامی کی چکی کے پاٹ سے استعماری آقاؤں کے اشاروں پر گردش کرتے چلے آرہے ہیں وہیں سیاسی سطح پر مفاہمت پسندی نے ان کے جذبۂ عمل اور شدت جذبات کی نکاسی کی راہیں روک دی تھیں۔

"کینوس" کی شاعری کا بہت بڑا حصہ رومانی وفور ہوتے ہوئے بھی ایسے سوجھ بوجھ رکھنے والے نوجوان کی نشاندہی کرتا ہے جس کے ہونٹ ایک اندرونی تپش کے سبب پپڑائے ہوئے ہوں اور وہ بے چینی سے کسی چشمۂ آب کی جستجو میں ہو، ان کے اشعار میں ہمیں ان کی اس تلاش، اس لگن اور اس پیاس کی جھلکیاں بآسانی مل جاتی ہیں۔

عرفانؔ صدیقی کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ایک طرف پرانے موضوعات کو نئی لفظیات کے ذریعہ ادا کیا اور دوسری طرف شاعری کو نئے موضوعات ومضامین سے متعارف کرایا اس خصوصیت میں ان کے معاصرین میں سے چند ہی ان کے مقابل ٹھہرتے ہیں ان کے یہاں ہر طرح کے موضوعات نظر آتے ہیں لیکن بعض موضوعات کی نوعیت اور اس کی پیش کش کا انداز ان کے یہاں دوسروں سے مختلف ہے مثلاً عشقیہ شاعری میں لمسیہ اشعار نہایت مبتذل اور سوقیانہ انداز میں کہے گئے ہیں لیکن بدن کے لمسیاتی رموز واسرار کو جس طرح عرفانؔ صدیقی نے منکشف کیا ہے ان سے قبل کسی شاعر نے بھی جسم کے رازہائے سربستہ کو اس طرح ظاہر نہیں کیا کہ دامن تہذیب بھی ہاتھ میں رہے اور بدن کی ساری کیفیات بھی بیان ہو جائیں چند اشعار بطور نمونہ "کینوس" سے ملاحظہ فرمائیں:

کہیں کسی کے بدن سے بدن نہ چھو جائے
اس احتیاط میں خواہش کا ڈھنگ سا کچھ ہے

کھلتے ہی نہیں لمس پہ اس جسم کے اسرار
سیاح عجب شہر طلسمات میں گم ہے

میں ڈوب گیا جب ترے پیکر میں تو ٹوٹا!
یہ وہم کہ تو خود ہی مری ذات میں گم ہے

میں سمندر ہوں، نہ تو میرا شناور، پیارے
تو بیاباں ہے، نہ میں خاک تری چھان سکوں

جسم کی رعنائیوں تک خواہشوں کی بھیڑ ہے
یہ تماشا ختم ہو جائے تو گھر جائیں گے لوگ

تھکے ہونٹوں سے بوسوں کے پرندے اڑتے جاتے ہیں
ہوس جاڑے کی شاموں کی اداسی ہوتی جاتی ہے

وہ خدا ہے کہ صنم ہاتھ لگا کر دیکھیں!
آج اس شخص کو نزدیک بلا کر دیکھیں

جسم کو جسم سے ملنے نہیں دیتی کم بخت
اب تکلف کی یہ دیوار گرا کر دیکھیں!

اس تکلف سے نہ پوشاک بدن گیر میں آ
خواب کی طرح کبھی خواب کی تعبیر میں آ

سنا تھا میں نے کہ فطرت خلاء کی دشمن ہے
سو وہ بدن مری تنہائیوں کو پاٹ گیا!

لوگ دریا میں اترنے سے ڈراتے ہیں بہت
جسم پانی میں ڈبو نے نہیں دیتا کوئی

آنکھوں میں ہیں گزری ہوئی راتوں کے خرابے
پہلو میں وہ سرمایۂ بستر تو نہیں تھا

کبھی شراب، کبھی انگبیں، کبھی زہر آب
وصال کیا ہے کسی کے بدن کا جادو ہے

ہماری کلاسیکی شاعری میں ایک اہم روایت تصوف کی روایت بھی رہی ہے تصوف

کے دواقسام ہیں ایک نظریاتی اور ایک عملی ،نظریاتی تصوف ایک رشتہ کی طرح ہے یعنی خدا اور انسان کے مابین تعلق کی تلاش کا نام تصوف ہے۔دوسری قسم عملی ہے جس کے اثرات عرفان صدیقی کے یہاں دیکھنے میں آتے ہیں یعنی تصوف انسانی زندگی میں کس حد تک دخیل ودحیل ہے۔عرفان صدیقی کے یہاں اس صوفی منشی کا انداز تو نہیں ہے جو خواجہ درد اور حیدر علی آتش کے یہاں ہے اس لئے عرفان صدیقی کی شاعری کو صوفیانہ شاعری تو نہیں کہیں گے مگر ان کے یہاں تصوف کا زبردست ادراک دیکھنے میں آتا ہے اور تصوف کی اصطلاحات مثلاً ابدال، قلندر، مجذوب، سلوک، آئینہ، بیعت وغیرہ استعمال ہوئی ہیں:

ناچیز بھی خُوباں سے ملاقات میں گم ہے
مجذوب ذرا سیرِ مقامات میں گم ہے

ملالِ دولتِ بردہ پہ خاک ڈالتے ہیں
ہم اپنی خاک سے پھر گنجِ زر نکالتے ہیں

یہ کائنات مرے بال وپر کے بس کی نہیں
تو کیا کروں سفرِ ذات کرتا رہتا ہوں

مدت سے فقیروں کا یہ رشتہ ہے فلک سے
جس سمت وہ ہوتا ہے ادھر ہم نہیں ہوتے

گدا وشاہ سے میرا تپاک ایک سا ہے
کہ کج کلاہ بھی میں ، بوریا نشین بھی میں

یہی اک دھوپ کا ٹکڑا یہی اک کوزۂ خاک
ہم اسے دولت اسکندر وجم جانتے ہیں

ہمیشہ کاسۂ خالی چھلکتا رہتا ہے
فقیر ہوں ، سو کرامات کرتا رہتا ہوں

فقیری میں یہ تھوڑی سی تن آسانی بھی کرتے ہیں
کہ ہم دست کرم دنیا پہ ارزانی بھی کرتے ہیں

کوئی سلطان نہیں میرے سوا مرا شریک
مسند خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے

تصوف انسان پر ہونے والے ظلم کے خلاف ایک احتجاج ہے اس طرح کسی نہ کسی حد تک یہ ظالم کے ظلم کی قلعی کھولنے کا کام انجام دیتا ہے اور مظلوم میں ظلم کے مقابلہ کی طاقت وسکت پیدا کرتا ہے۔ تصوف جبر کے طریقۂ کار جو مذہب میں قائم ہیں ان جبریہ عناصر کے خلاف بھی احتجاج کرتا ہے بلکہ صحیح معنی میں ملاؤں کی مذہب کے نام پر جو جکڑ بندیاں، سختیاں اور ظاہرداریاں ہیں ان سب کے خلاف اعلان بغاوت ہے۔

تصوف کی سب سے اہم تعلیم یہ ہے کہ انسانوں میں تفریق کا قائل نہیں ہے بلکہ وہ تمام انسانوں کو خدا کا بندہ ہونے کے سبب برابر قرار دیتا ہے اور مذہبی جبریہ نظام کے خلاف اور اس سے پیدا ہونے والی گھٹن کے خلاف چیلنج کرتا ہے اور ایک خاص قسم کی آزادانہ فضا کا متلاشی نظر آتا ہے۔ تصوف انسان کی خوبیوں کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتا ہے۔ اور خامیوں کی پردہ پوشی کرتا ہے یہی اس کا اہم اور نمایاں پہلو ہے جو عرفان صدیقی کے یہاں جگہ جگہ ملتا ہے یعنی جبری نظام کے خلاف بغاوت اور انسانی خوبیوں کا اثبات۔

تصوف کا معاملہ بنیادی طور پر حال کا معاملہ ہے قال کا نہیں، تمام صوفیا نے کہا ہے کہ تصوف ایسی چیز نہیں ہے جسے آپ دوسرے کو سمجھا سکیں یا بیان کر سکیں وہ تو ایک کیفیت ہے اور ایک واردات ہے جسے صاحبان دل ہی محسوس کر سکتے ہیں، عرفان صدیقی کے یہاں جو پہلو خاص طور سے ملتا ہے وہ انسان کی اچھائیوں کا اثبات ہے اور تصوف نے بحیثیت ایک تحریک کے بعض چیزوں سے جو انحراف وبغاوت کی اس کو پہچاننا ان کا بنیادی مقصد ہے تصوف کی ایک شاخ سلوک ہے اور سلوک کے مختلف رشتے اور مختلف مدارج ہیں اور ان مدارج پر جو لوگ فائز ہیں ان کے بھی درجات ہیں، عرفان صدیقی کا مشہور شعر ہے:

ورنہ ہم ابدال بھلا کب ترک قناعت کرتے ہیں
ایک تقاضا رنج سفر کا خواہش مال ومنال میں تھا

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ آج بھی ابدال موجود ہیں اور ترک ہوس کا نام قناعت ہے اصل بات اس میں خواہش مال ومنال نہیں ہے بلکہ رنج سفر ہے یہ داخلی کیفیت ہے اسے لوگ خواہش مال ومنال سے تعبیر کرتے ہیں۔ترک ہوس انسان کی ایک اہم خوبی ہے اور عرفان صدیقی اپنی شاعری میں وہ اصطلاحات برتتے ہیں جو انسانی زندگی میں نظر آتی ہیں کیونکہ ہوس کا سلسلہ بھی در پردہ ظلم سے ملا ہوا ہے۔ ہوس انسان کو جن چیزوں پر آمادہ کرتی ہے وہ ناانصافی اور ظلم کو جنم دیتی ہے، عرفان صدیقی سارے مسائل کا حل 'ترک ہوس' کو قرار دیتے ہیں۔

ظلم کے خلاف سب سے پر قوت استعارہ کربلا ہے اسی وجہ سے عرفان صدیقی کے یہاں کربلا اور اس کے جزئیات کا ذکر بہت آتا ہے کربلا ایک علامت کے طور پر ہماری اردو شاعری میں عرفان صدیقی سے پہلے بھی موجود تھی مگر ان سے قبل بہت کمزور استعارہ تھی عرفان صدیقی نے اس کو بالالتزام برتا اور بہت آگے بڑھا دیا اور اس علامت میں نئے نئے مفاہیم پیدا کیے، کربلائی ماحول عرفان صدیقی کے خمیر میں شامل ہے ان کی تربیت کچھ اس طرح سے ہوئی کہ یہ سب علائم ورموز ان کی طبیعت میں رچ بس گئے اس میں ان کی والدہ کا بنیادی کردار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ علامتیں انہیں اچانک اہم معلوم ہونے لگیں ہوں او رانہیں نے اسے نظم کر دیا ہو بلکہ یہ ان کی شاعری کا اساسی موضوع ہے:

بڑھتے ہوئے دشمن جیسی دوپہر
نیزوں جیسی تیز نکیلی دھوپ

سروں کے پھول سرنوک نیزہ ہنستے رہے
یہ فصل سوکھی ہوئی ٹہنیوں پہ پھلتی رہی

معصوم چہرہ تیز نگاہوں کی زد میں ہے
نیزے ہیں نرم کھیت کے دل میں گڑے ہوئے

تو وہ شب بھر کی رونق چند خیموں کی بدولت تھی
اب اس میدان میں سنسان ٹیلوں کے سوا کیا تھا

پھر اک عجیب تماشہ رہے گا صدیوں تک
یہ کارزار کمان و گلو ہے کتنی دیر

ظلم وتشدد، جبر واستبداد کے خلاف خودی کا اثبات واقعات کربلا کا بہت بڑا استعارہ ہے اور یہی عرفان صدیقی کی شاعری کا اہم پہلو ہے بلکہ نقطۂ ارتکاز ہے ان کی تمام شاعری اسی کے گرد گھومتی ہے۔

ہمارے عہد کے انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس پر ظلم ہوتا ہے مگر وہ ظالم قوتوں کی شناخت نہیں کر پاتا ہے اسے یہ پتہ لگانا نہایت دشوار ہوگیا ہے کہ اس پر ظلم کس نے کیا ہے چونکہ ظلم کے وسائل اس قدر وسیع ہو گئے ہیں ان تک مظلوموں کی رسائی ناممکن ہے نتیجہ میں مظلوم عدم اعتماد کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ ماضی میں ظلم کی شناخت آسان تھی کیونکہ ظلم کے وسائل محدود تھے۔ لہٰذا ظالم کا مقابلہ بھی بآسانی کیا جا سکتا تھا مگر آج ظلم کے بڑھتے ہوئے وسائل کو دیکھتے ہوئے ظالم سے معرکۂ آرائی بہت مشکل ہوگئی ہے اس کا ایک سبب منافقت بھی ہے ہمارے اس عہد میں اس قدر منافقت ہے کہ ہمیں یہ طے کرنا مشکل ہوگیا ہے کہ کون شخص ہمارا مخالف ہے اور کون موافق ہے؟ جو بظاہر مہربان اور مشفق ہے وہ بباطن ہمیں کمزور بنا رہا ہے اور ہم پر ہمدردی کے پردہ میں مظالم ڈھا رہا ہے فی زمانا ظلم کی اتنی جہات ہیں کہ ان کا شمار کرنا ناممکن ہے۔ عرفان صدیقی ظلم اور ناانصافی اور اسی طرح کی دیگر طاقتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں :

کس کو دیں قتل کا الزام بڑی مشکل ہے
جو بھی قاتل ہے ہماری ہی طرح بسمل ہے

اب ایسے شخص کو قاتل کہیں تو کیسے کہیں
لہو کا کوئی نشاں اس کی آستیں پہ نہیں

تو ہی بول اے مرے بے جرم لہو کی تحریر
کوئی دھبہ نہیں چلتی ہوئی تلواروں پر

وقت کے ہاتھ میں دیکھا تو کوئی تیر نہ تھا
روح کے جسم پہ زخموں کے نشاں تھے کتنے

آستیں پر کوئی دھبّہ تو نہیں ہے لیکن
اس کی آنکھوں میں بہرحال، ندامت ہے وہی

بعض افراد ناواقفیت اور ضرورت کے ماتحت ظالم کا آلۂ کار بن جاتے ہیں جب ہمارے اپنے ہی لوگ ظلم کا آلۂ کار بنتے ہیں تو یہ مرحلہ بہت سخت جان ہوتا ہے جب کہ انہیں اس کا علم نہیں ہوتا کہ ان کے بعد انہیں بھی انہیں مظالم کا شکار ہونا ہے۔ عرفان صدیقی نے اس کی طرف بھی اپنے اشعار میں اشارے کئے ہیں دوستی کے پردہ میں کئے جانے والے مظالم کا مقابلہ بڑا مشکل ہوتا ہے جب بظاہر ایک دوست ایک دوسرے دوست سے برسرِ پیکار ہوتا ہے:

واقعی کیا اسی قاتل کی طرف تو بھی ہے
تو بھی ہے اے مری جاں، تیغ بکف تو بھی ہے

آسماں اپنی کماں توڑ چکا یہ نہ سمجھ!
اب کوئی تیر جو چھوٹا تو ہدف تو بھی ہے

یہ مت سمجھ کہ ترے قتل کا خیال نہ تھا
نکل چکی تھی مگر بے وفا چلی ہی نہیں

فقط یہ بڑھتا ہوا دستِ دوستی ہی نہیں
ہمیں قبول ہے وہ بھی جو آستین میں ہے

عرفان صدیقی ظلم کے خلاف مظلوم کی مزاحمت کے قائل ہیں وہ خاموشی سے مظالم سہنے والے کو بھی ظالموں میں محسوب کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح ظالم کے خلاف مظلوم کا ردعمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا بہت مشہور شعر ہے:

بہت کچھ دوستو! بسمل کے چپ رہنے سے ہوتا ہے
فقط اس خنجرِ دستِ جفا سے کچھ نہیں ہوتا !

عرفان صدیقی ظلم سہنے والے کو بھی اتنا ہی بڑا مجرم گردانتے ہیں جتنا ظالم کو کیونکہ ان کے نزدیک ظلم کو خاموشی سے برداشت کرتے رہنا بھی ظالم کو تقویت دینے کے مترادف ہے دراصل ہمارے عہد کا ایک بہت بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ صحافی اور سیاست داں بظاہر عوام کے ہمدرد ہوتے ہیں مگر سچ اور جھوٹ اس طرح مدغم کر دیتے ہیں کہ سچائی کی شناخت ہی مشکل ہو جائے شاعر مظلوموں کے جذبات کی سچی ترجمانی کرتا ہے:

اب بھی چپ رہتے تو مجرم نظر آتے ورنہ
سچ تو یہ ہے کہ ہمیں شوق نوا کچھ بھی نہ تھا

عرفان صدیقی نے ساری دنیا کے مظلوموں اور حریت پسندوں کی جدوجہد سے اپنی ذات کو احساس سپردگی کے ساتھ وابستہ کرلیا ہے دکھی انسانیت سے یہ احساس یگانگت (Sense of Identification) ان کے معاصرین کی شاعری میں بہت کم نظر آتا ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعری کے ابتدائی اسلوب پر گفتگو کی جائے اور ''کینوس'' کے سرنامہ ''سفر کی زنجیر'' کا ذکر نہ کیا جائے یہ ناممکن ہے کیونکہ عرفان صدیقی کے شاعری کے ابتدائی اسلوب کی اساس یہی نظم ہے۔

''سفر کی زنجیر'' ایک طویل نظم ہے اس میں شاعر نے اپنا ذہنی، تہذیبی، تاریخی، ادبی اور مذہبی پس منظر شعور کی رو (Stream of Conciousness) کی تکنیک میں پیش کیا ہے سفر کی زنجیر کا آغاز عرفان صدیقی نے غالب کے اس شعر سے کیا ہے :

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں

اس نظم میں مستعمل علامات واشارات اور تشبیہات واستعارات سے عرفان صدیقی کے مختلف ذہنی، جذباتی شعوری مراحل کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کن کن مرحلوں سے کس کس طرح گذرتے ہیں ان کی ذات کے خارج میں جو کچھ رونما ہوتا رہا ہے اس کا ان کی

ذات پر کیا اثر پڑتا رہا ہے اور اس اثر کو وہ کس طرح ظاہر کرتے ہیں۔ اس نظم میں بہت زیادہ وضاحتیں بھی نہیں ہیں مگر اس کے باوجود یہ عرفان صدیقی کا مکمل تعارف ہے اس میں زمان ومکان کا بیان بھی نہایت خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔

عرفان صدیقی کی زندگی یا ان کے شعور کی داستان اتنی نہیں ہے جتنی اس پورے دور میں پیدا ہونے والے اور پرورش پانے والے اور جواں ہونے کے بعد ادھیڑ ہونے والے دنوں کی بات ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے شاید اسی لئے اس کے اختتام پر ناتمام لکھا ہوا ہے۔

''سفر کی زنجیر'' کا جو زمانہ قائم ہوتا ہے وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ ہے اس میں برصغیر میں تقسیم کے المیہ اثرات صاف طور پر نمایاں ہیں:

پیڑ دو حصوں میں بٹ جائے تو کیا ہوتا ہے ؟
جشن آزادئ جمہور منانے کے لئے
کل سے اسکول میں تعطیل رہے گی بچو!
(ڈور جب بیچ سے کٹ جائے تو کیا ہوتا ہے؟)
ہم بھی کل شام کی گاڑی سے چلے جائیں گے
آج ہی پاپا کا لاہور سے خط آیا ہے
ہم یہی بیل وہاں لان میں لگوائیں گے
قافلے سینۂ گیتی پہ رواں ہیں کہ جو تھے
اے زمیں، میری زمیں، اس کی زمیں، سب کی زمیں

یہ نظم ایک پوری تہذیب کے خاتمہ کا نوحہ ہے مگر عرفان صدیقی کا کمال یہ ہے کہ وہ اس نظم میں کسی بھی مقام پر ماتم سرا نظر نہیں آتے بلکہ مستقبل میں نئی نسل کو تہذیب سازی کی دعوت دیتے ہیں وہ تارکین وطن سے زیادہ مجروح ساکنین وطن کو سمجھتے ہیں جو ترک وطن نہیں کر سکتے ان کے مسائل زیادہ ژولیدہ و پیچیدہ ہیں۔ عرفان صدیقی ساکنین وطن کے مسائل کو تارکین وطن کے مسائل سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ عرفان صدیقی کو تہذیب کے

خاتمہ کا رنج اتنا نہیں ہے جتنا بحیثیت شاعر کے انہیں اس کا رنج ہے کہ کسی دوسری تہذیب کی تشکیل نہیں ہو پا رہی ہے کیونکہ اقدار تو ہوتے ہی بدلنے کے لئے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں جب کہ بہت سی قدریں ہم زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

عرفان صدیقی ان چیزوں کا ماتم نہیں کرتے جو ٹوٹ گئی ہیں ہر چند کہ ان سے ان کا جذباتی لگاؤ تھا اس میں بہت سی چیزیں انہیں عزیز تھیں لیکن وہ اس کی نوحہ خوانی کو فضول سمجھتے ہیں کیونکہ ان کی تلافی ممکن نہیں ہے لہٰذا وہ اس کی دوبارہ بازیافت بھی نہیں کرتے مگر انہیں اس کا شدید احساس ہے کہ کوئی ایسا نیا نظام ہمارے سامنے نہیں آپا رہا ہے جسے اطمینان بخش کہا جا سکے۔ وہ نہ ہندوستان میں ہے اور نہ پاکستان میں ہے مثلاً تقسیم سے پہلے جو سماج کی کیفیت تھی کہ دولت کی تلاش میں تمام حدود کو توڑ دنیا اور دولت کے حصول کے لئے تمام اقدار کو بالائے طاق رکھ دینا بہت خراب بات سمجھی جاتی تھی مگر اب یہ خراب بات نہیں ہے:

(میں نئے ملک کی سرحد سے پلٹ آؤں گا)
"رک کہ میں آیۂ کرسی تو ذرا دم کر دوں"
مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر!
ان گنت رستے ہتھیلی کی لکیروں کی طرح
ان میں کوئی کشش کاف کرم ہو شاید
میں کہاں جاکے رکوں گا مجھے معلوم نہیں
حسن کب تجربۂ ذات میں ڈھل پائے گا
ظلمتیں ، روشنیاں ، سلسلۂ شام وسحر
سب تماشا ہے تو تقریب تماشا کیا ہے
حلقہ در حلقہ پُر اسرار سفر کی زنجیر
دیکھتے جاؤ کہ تم نے ابھی دیکھا کیا ہے؟

عرفان صدیقی کو رنج اسی بات کا ہے کہ ابھی تک ہمارے معاشرے میں وہ

نیا نظام (تہذیب) نہیں آیا جسے ہم مسابقہ کا نعم البدل قرار دیں جبکہ سماجی ڈھانچہ سال دو سال میں تیار نہیں ہوتا بلکہ اسے تیار ہونے میں برسوں لگتے ہیں۔ عرفان صدیقی کی شاعری میں ان کے اس المیہ کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں کہ جو نظام تھا اس کا خاتمہ ہو گیا اور کسی نئے نظام کی تشکیل نہیں ہو پا رہی ہے۔

''سفر کی زنجیر'' میں عرفان صدیقی کے فکری جذبات اور فنی جہات بڑی خوش اسلوبی سے ہم آمیز ہوئے ہیں۔ اس نظم کا کینوس بہت وسیع ہے اور اس کا اسٹرکچر تصوراتی ہے یعنی اس میں تاریخی، تہذیبی، تمدنی اور سیاسی تصورات کو نہایت فن کارانہ مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ انسانوں سے گہری ہمدردی، ظلم و استبداد کے خلاف احتجاج کا جذبہ اور انقلاب کا ایک والہانہ تصور شاعر کی پرسوز شخصیت کے غماز ہیں۔ یہ نظم اپنی ہیئت میں نامیاتی وحدت کی خصوصیت کی حامل ہے امیجز (Images) اس کی تعمیر میں زینہ بہ زینہ اس طرح حصہ لیتی جاتی ہیں کہ آپ کسی مصرع کو بھی حتیٰ کہ کسی لفظ کو بھی اس نظم سے ہٹا نہیں سکتے اور وہ ساری امیجز ٹھوس اور محسوس تصویری قدر کی حامل ہیں، نظم کیا ہے ایک ایکشن پینٹنگ (Action Painting) ہے کہ اس کا ہر نقطہ ہر لفظ رقص کناں نظم کے دائرہ کو مکمل کرتا ہے۔

اس نظم کے بالاستیعاب مطالعہ سے ابتدائی مرحلہ ہی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ عرفان صدیقی جس اسلوب کو لے کر اردو شاعری میں داخل ہو رہے ہیں وہ مستعار لیا ہوا اسلوب نہیں ہے بلکہ وہ ان کا اپنا خود ساختہ اسلوب ہے اور اسے انہوں نے میر کی انفعالیت اور یگانہ کی جارحیت کے درمیان سے دریافت کیا ہے۔ میر اور یگانہ کے اسالیب کے حسین امتزاج سے جو اسلوب بنتا ہے وہ عرفان صدیقی کا اسلوب ہے۔

عرفان صدیقی کے امتیازی لہجے

اور

انفرادی اسلوب کا جائزہ

میرا خیال ہے کہ لسانی روایت سے وابستہ شاعری میں متکلم وسامع کے عمل، الفاظ کی رموز واوقاف سے وابستگی، حروف اور الفاظ پر زور دینے اور زبان کو کہنے اور آہنگ کے ساتھ ترسیلی سطح پر برتنے کا نام شعری لہجہ ہے جہاں تک عرفان صدیقی کے شعری لہجہ کا تعلق ہے تو ان کے شعری لہجہ کے تعین میں زبان کی نحوی ساخت سے انحراف اور حرف وصوت کی ادائیگی کا انفرادی انداز بہت اہم ہے ہر چند کہ عرفان صدیقی کا متن اپنی معنوی دبازت کی عقدہ کشائی کے لئے استعاراتی اور علامتی طرز کا سہارا لیتا ہے مگر عرفان صدیقی کا شاعرانہ لہجہ بھی معنی آفرینی کے عمل میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

شاعری میں محاورہ اور روزمرہ کا خیال، زبان کو روایتی سلاست اور روانی کے ساتھ استعمال کرنا اور رائج لسانی ضابطوں کے غایت احتیاط کے ساتھ برتنا، زبان میں اپنے مخصوص طرز ادا کے ذریعہ نئے معنی کا امکان پیدا کرنا اور لہجے کے نشیب وفراز سے مفہوم میں کسی نئی جہت کی گنجائش پیدا کرنا عرفان صدیقی کا مخصوص ہنر ہے۔

عرفان صدیقی کے یہاں شعری خیال بھی ایسی حیرت انگیز وحدت کے ساتھ ابھرتا ہے کہ اس کے لئے نظر ثانی کی بھی گنجائش نہیں رہتی ۔ عام طور پر شاعر کو ایک شعر کے مکمل کرنے کے لئے تلازمات اور کئی لوازمات سے کام لینا پڑتا ہے ردیف اور قوافی بعض

اوقات ابلاغ میں حائل ہو جاتے ہیں لیکن عرفانؔ صدیقی کا ہر شعر اظہار میں ایسا مکمل اور ایسا فوری (Spontanious) ہے کہ اسے سوائے تخلیقی معجزے کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، عرفانؔ صدیقی کے خیال اور ہیئت میں ایسی یک جائی اور ہم آہنگی ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کثرت سے پائے جاتے ہیں جو ان کی غیر معمولی شعری صلاحیتوں کی غمازی کرتے ہیں چند اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں:

تم پرندوں سے زیادہ تو نہیں ہو آزاد
شام ہونے کو ہے اب گھر کی طرف لوٹ چلو

لہو رکاب پہ ہے اور شکار زین میں ہے
مگر کمند ابھی دستِ سبکتگین میں ہے

ہر طرف پرسش غم ، پرسش غم ، پرسش غم
چین سے بوجھ بھی ڈھونے نہیں دیتا کوئی

غزلوں میں تو یوں کہنے کا دستور ہے ورنہ
سچ مچ مرا محبوب ستم گر تو نہیں تھا

سبک نہ تھا ترا بازوئے تیغ زن اتنا
ترے ہنر میں میرے بانکپن کا جادو ہے

بزرگ وقت ، کسی شے کو لا زوال بھی کر
تو کیسا شعبدہ گر ہے ، کوئی کمال بھی کر

میں شب اداس بہت تھا تو مہرباں موسم
گلے میں بازوئے مہتاب ڈالنے آیا

پھر کوئی خیمہ کسی اذنِ عقوبت کا شکار
پھر کوئی نیزہ کسی دولت سر کا وارث

میں نئے موسم میں برگ تازہ بن کر آوں گا
پھر ملیں گے اے ہوائے شاخسار اگلے برس

عجب خلائے سخن ہے سماعتوں کے ادھر
یہ کون بول رہا ہے زبانِ گمشدگاں

ندی سے پھول ، نہ گنج گہر نکلتا ہے
جو طشتِ موج اٹھاتا ہوں ، سر نکلتا ہے

پیاس نے آبِ رواں کو کر دیا موجِ سراب
یہ تماشا دیکھ کر دریا کو حیرانی ہوئی

اپنا ہی چہرہ انہیں مجھ میں دکھائی دے گا
لوگ تصویر سمجھتے ہیں ، میں آئینا ہوں

ناچیز بھی خُوباں سے ملاقات میں گم ہے
مجذوب ذرا سیر مقامات میں گم ہے

بہت ہے ، آئینے جن قیمتوں پہ بک جائیں
یہ پتھروں کا زمانہ ہے شیشہ گر میرے

تیرا یقین سچ ہے ، مری چشمِ اعتبار
سب کچھ فصیلِ شب کے ادھر بھی اسی کا ہے

میں اور سیلِ گریہ خدا ساز بات ہے
قسمت میں تھا خزینۂ گوہر لکھا ہوا

اسی کا خانۂ ویراں اسی کا طاق ابد
میں اِک چراغ ہوں چاہے جہاں جلائے مجھے

مدت سے فقیروں کا یہ رشتہ ہے فلک سے
جس سمت وہ ہوتا ہے ادھر ہم نہیں ہوتے

آئینہ چمکے تو ہوتا ہے سراپا روشن
دل جو روشن ہے ، مری جان تو دنیا روشن

مندرجہ بالا اشعار میں لغوی اور محاوراتی معنوں کے تصادم سے قول محال یا پیراڈوکس (Paradox) کی تخلیق کی جو کیفیت ملتی ہے اس کا سلسلہ عام انسانی تجربات سے لے کر روحانی یا متصوفانہ تصور کائنات تک جاتا ہے وہ تصوف کے گہرے مسائل کی ترجمانی کرنے کے بجائے لفظوں کی مدد سے ایک پرقوت کائنات کی تشکیل کرتے ہیں۔

عرفان صدیقی کے کلام میں روزمرہ، محاورہ، استعارہ اور تمثیل کا جو استعمال ملتا ہے وہ عموماً کسی معروض (Object) کی نمائندگی کے بجائے اپنے آپ میں الفاظ کو معروض کی حیثیت سے برتنے پر قائم ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ خود بجائے انسانی تجربے یا تصور کائنات کی تخلیق کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ وہ مناسبت یا تضاد جس کو لفظوں کی سطح پر روا رکھا گیا ہے وہ کائنات کے متناسب یا متضاد نظام کو نئے سرے سے مرتب کرتا ہے۔ درج شدہ اشعار میں لہجہ کا رول بھی زبان کے رول سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لہجے کے فرق سے ہی قائل اور قول کی نوعیت متعین ہوتی ہے اور صحیح قرأت کے بغیر عام فہم الفاظ کے استعمال کے باوجود معنی مبہم رہتے ہیں لیکن عرفان صدیقی کی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر مانوس الفاظ کو بھی اپنے شعری لہجے کی کشش سے مانوس اور عام فہم بنا دیتے ہیں۔

عرفان صدیقی کے یہاں استفہامیہ اور استعجابیہ، قاری کو بادی النظر میں منعطف کر لیتا ہے۔ ان کی متعدد غزلیں ایسی ہیں جن میں زمین کے استعمال اور ردیف کے انتخاب نے پوری پوری غزل کو سوالیہ اور استفہامیہ اشعار کا مجموعہ بنا دیا ہے وہ کبھی لفظوں اور آوازوں کی تکرار سے کبھی کسی لفظ میں تخفیف یا اضافے کے ذریعے، کبھی کسی مناسبات لفظی کی بنیاد پر اپنے لہجے میں ارتعاشات پیدا کرتے ہیں اور کبھی مکالمے، تقابل اور موازنے کا

طریقہ استعمال کر کے متناسب یا متضاد صورت حال کو ابھارتے ہیں۔ لہجے کا تنوع ان کی شاعری میں بلند آہنگی اور شکوہ، کبھی ٹھہراؤ، کبھی سرگوشی، کبھی محزونی، کبھی دھیما پن اور کبھی نرم روی پیدا کر دیتا ہے اس پر مستزاد یہ ہے کہ کثرت مضامین کے باوجود ان کا لہجہ کبھی پست اور انفعالیت زدہ نہیں ہوتا ہے۔

عرفان صدیقی کا شعری لہجہ مختلف اور منفرد ہی نہیں بلکہ چونکا دینے والا بھی ہے انھوں نے اپنی شاعری، اپنی تراکیب، اپنی لفظیات، اپنے افکار، اپنے خیالات، اپنے زاویۂ نگاہ، اپنے ڈکشن اور اپنی بندشوں سے ادبی دنیا کے ساتھ ساتھ آج کے قاری اور سامع کو بھی چونکایا ہے۔ عرفان صدیقی کے ہر شعر میں معانی کے جہان اور مفاہیم کی دنیا آباد ہے۔ عرفان صدیقی کے یہاں قدم قدم پر منفرد اور چونکا دینے والے لہجے میں ایسے ایسے اشعار ہیں کہ اگر ان میں سے ایک شعر بھی کوئی کہہ لے تو وہ اس کی ادبی زندگی کی ضمانت بن جائے۔ ایسے چونکا دینے والے شعر حیرت انگیز حد تک سادہ بلکہ سہل ممتنع کے انداز میں ہیں۔ عرفان صدیقی نے حیرت انگیز طور پر (Epigramatic) کم سے کم الفاظ میں جذبات و خیالات کی ایک دنیا بسا کر دکھائی ہے۔ اس نوع کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

خرابہ تھا مگر ایسا نہیں تھا
عزیزو! میرا گھر ایسا نہیں تھا

مجھے بھی حکم نہیں شہر سے نکلنے کا
مرا حریف بھی میدان میں نہیں آتا

لکھ رہی ہیں سلگتی ہوئی انگلیاں
دھوپ کے شہر میں سائبانوں کے نام

تنہا نہیں میں نواحِ شب میں
آہٹ سنائی دے تو جانوں

تابندہ ہے دلوں میں لہو روشنائی سے
دنیا کے نام نامۂ سرور لکھا ہوا

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچئے آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

عرفان صدیقی نے اپنے انوکھے تصورات اور اپنے نرالے طرز ترسیل، اشاریت اور ابہام کی وجہ سے اپنی شناخت قائم کی ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری کہیں کہیں ان کی شخصیت کی طرح پر اسرار نظر آتی ہے۔ اشاریت، ابہام، اور پیچیدہ علامات نے عرفان صدیقی کی بعض غزلوں کو عام قاری کے لئے سربستہ راز اور چیستاں بنادیا ہے اردو غزل میں عرفان صدیقی کی حیثیت ایک روایت شکن شاعر کی ہے جس نے موضوع اور ہیئت دونوں سے انحراف کرکے اپنی ایک نئی راہ نکالی ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعری کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ کبھی کوئی بات کھل کر نہیں کہتے جو بات بھی کہنی ہوتی ہے اسے رمزیت اور ایمائیت کے لہجے میں کہتے ہیں اور تفہیم شعر اور اخذ معنی قاری کے وجدان اور ذوق شعری کے لئے رکھ چھوڑتے ہیں۔ وہ تفصیل کے نہیں اجمال کے شاعر ہیں۔ ان کے شعروں میں وہ اشاراتی انداز اور کہی ان کہی کی درمیانی کیفیت ہوتی ہے جیسے لفظ سرگوشی کررہے ہوں۔ وہ خوبصورت استعاروں، نئی ترکیبوں اور لفظوں کی تکرار سے ایک معنوی فضا تیار کرتے ہیں جسے محسوس کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آہستہ روی، نرم کلامی، اور مدھم لے ان کی پہچان ہے اس کا سبب یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر کلاسیکی مزاج رکھتے ہیں۔ زندگی کے بدلتے اقدار پر ان کی نظر ہے اور اردو فارسی کی شعری روایت سے بھی انھوں نے اپنا رشتہ قائم کررکھا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرلینا مناسب نہیں ہے کہ وہ روایت پرست ہیں۔ بیان کیا جاچکا ہے کہ عرفان صدیقی روایت پرست نہیں ہیں البتہ روایت پر ان کی گہری نظر ہے اور اس کا احترام بھی ان کے یہاں ملتا ہے۔ ضرورت کے مطابق اس سے وہ کام بھی لیتے ہیں اور اسی وصف نے ان کے شعروں کو کلاسیکی رچاؤ اور تغزل کی کیفیت عطا کی ہے جو ان کے معاصرین کے یہاں کمیاب ہے۔

عرفانؔ صدیقی کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ارتقاء ہے۔ ان کی شاعری ایک محور پر نہیں گھوم رہی ہے بلکہ نئے امکانات اور نئے زاویئے تلاش کر رہی ہے ہر لمحہ رواں دواں زندگی ہے یہ مطابقت جنیون (Genuine) فنکاروں کے یہاں ہوتی ہے ان کا خلاق ذہن شعر کی نئی جہات کی تلاش میں ہمہ وقت سرگرداں رہتا ہے۔ ان کی اسی تلاش کا نتیجہ ہے ان کی شاعری کا وہ حصہ جو بدن کی جمالیات پر مشتمل ہے۔ بدن کی جمالیات پر اردو شاعری میں سب سے زیادہ فراقؔ نے شعر کہے ہیں لیکن فراقؔ نے اس قبیل کی شاعری کے رموز کو پوری طرح نہیں سمجھا جس کی وجہ سے وہ سطحی شاعری کے زمرے سے باہر نہیں آسکی اس کے علی الرغم عرفانؔ صدیقی نے بدن کے جمالیات کو بڑے سلیقہ سے پیش کیا ہے۔ جمالیاتی شاعری کے جتنے بھی ممکنہ پہلو ہو سکتے ہیں عرفان صدیقی نے انہیں بخوبی نمایاں کیا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو شاعری کی ایک بہت بڑی کمی کو عرفانؔ صدیقی نے دور کیا ہے اور غزل کے دامن کو جسمانی شاعری سے بھر دیا ہے۔ ہم عرفان صدیقی کی جمالیاتی شاعری کو بغیر کسی تردد کے عالمی ادب کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔

عرض کیا جا چکا ہے عرفانؔ صدیقی نے بدن کے لمسیات کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے اور اس طرح کے کلام کو ایک الگ شکل میں ''عشق نامہ'' کے نام سے مرتب کیا ہے جس پر ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے فی الوقت ان کے ابتدائی کلام سے چند اشعار بطور نمونہ حاضر ہیں:

کہیں کسی کے بدن سے بدن نہ چھو جائے
اس احتیاط میں خواہش کا ڈھنگ سا کچھ ہے

حیراں ہوں کہ پھر اس نے نہ کی صبر کی تاکید
بازو جو میرا بازوئے دلدار میں آیا

عارض کی دھوپ زلف کے سائے بدن کی آنچ
ہنگامہ بن کے دل میں بپا ہو گئی ہے شام

اس کی آنکھوں میں بھی رقصاں ہے وہی گرمی شوق
غالبًا محرمِ اسرارِ بدن وہ بھی ہے

اس کے حلقے میں تگ وتاز کی وسعت ہے بہت
آہوئے شہر مری بانہوں کی زنجیر میں آ
اداس خشک لبوں پر لرز رہا ہوگا
وہ ایک بوسہ جو اب تک مری جبیں پہ نہیں

عجب گداز پرندے بدن میں اڑتے ہیں
اسے گلے سے لگائے ہوئے زمانہ ہوا

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی کے یہاں بدن کی لمسیاتی شاعری ابتدا ہی سے موجود تھی مگر آگے چل کر اس نے ایک رجحان کی شکل اختیار کر لی اور "عشق نامہ" کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس ضمن میں عرفان صدیقی کے یہاں وہ ساری لطیف اور تازہ کار تشبیہیں، استعارے اور تراکیب آئی ہیں جو عرفان صدیقی کی شناخت بن گئی ہیں۔ اور قاری وسامع کے دل ودماغ میں روشنی کی لکیر اور آسودگی کے دائرے پیدا کرتی ہوئی گزر جاتی ہیں غرض کہ ان کے یہاں لمسیات کی ایک دنیا آباد ہے جو غنائی اور جمالیاتی کیفیت بیدار کرتی ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعری میں جمال وجلال کا اِئتلاف بڑی ہنر مندی اور فنکارانہ چابک دستی سے ہوا ہے۔ اُن کی شاعری ہمیں تفکر کی نئی جہات سے روشناس کراتی ہے۔ انھوں نے تشبیہات واستعارات اور رموز وعلائم کو اپنی شاعری میں اس قدر حسین پیرائے میں برتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے اسرار فطرت کے اظہار کے لئے ان کی فکری کارگاہ میں اسالیب خود بخود ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ عرفان صدیقی نے رموز تخلیق اور اسرار کائنات کو سمجھا ہے یہی وجہ ہے کہ افلاس، سامراجی استحصال اور جبر واستبداد کی گرم ہواؤں میں جھلستے ہوئے اور کراہتے ہوئے نیم جاں افراد کیلئے عرفان صدیقی کی شاعری شجر سایہ دار کی

حیثیت رکھتی ہے۔عرفان صدیقی کی انسان دوستی اوران کے غنائی لہجہ کاذکراس مقام پر بے محل نہیں ہوگا۔عرفان صدیقی ظلم کے خلاف احتجاج اور مظلوم کی حمایت کا اعلان بیا نگ دہل کرتے ہیں لیکن اس اعلان میں وہ غزل کی حرمت کو مجروح نہیں ہونے دیتے۔عرفان صدیقی کی غزل کے دواہم عناصرایسے بھی ہیں جن کی طرف توجہ نہایت ضروری ہے۔ایک ان کا عربی داں ہونا اور دوسرے موسیقی سے لگاؤ اور موسیقی سے رمز شناسی، چنانچہ عرفان صدیقی کی غنائیت کوئی معمولی درجہ کی یا محض رومانیت کے وفور کا نتیجہ نہیں ہے۔اس غنائیت میں ان کا رجز یہ لہجہ برابر قائم رہتا ہے۔عرفان صدیقی کے نقطۂ نظر میں جہاں منطقی انداز اور حیلہ جوئی اور ''اگر مگر'' کا کوئی گزر نہیں، وہیں وہ دوسروں کے لئے منافقت اور ریاکاری کو بھی برداشت نہیں کرتے ان کے اس رویہ کی گونج ان کی شاعری میں جابجا سنائی دیتی ہے:

فقط یہ بڑھتا ہوا دست دوستی ہی نہیں
ہمیں قبول ہے وہ بھی جو آستین میں ہے

عجب حریف تھا میرے ہی ساتھ ڈوب گیا
مرے سفینے کو غرقاب دیکھنے کے لئے

بچا رہا تھا میں شہ زور دشمنوں سے اسے
مگر وہ شخص مجھی سے لپٹ گیا آخر

آسماں کی زد میں زیر آسماں میں ہی نہیں
تو بھی ہے ظالم نشانے پر یہاں میں ہی نہیں

آسماں اپنی کماں توڑ چکا ، یہ نہ سمجھ
اب کوئی تیر جو چھوٹا تو ہدف تو بھی ہے

شاخ کے بعد زمیں سے بھی جدا ہونا ہے
برگِ افتادہ ابھی رقص ہوا ہونا ہے

میں کس طرح ، مرے قاتل گلے لگاؤں تجھے
یہ تیر ، تیرے مرے درمیاں ، ابھی تک ہے

گُرگ وہاں کوئی سر نہیں کرتا آہو پر بندوق
اس بستی کو جنگل کہنا جنگل کی توہین

اتنی افسردہ نہ ہو کوچۂ قاتل کی ہوا
چھو کے تو دیکھ ابھی رنگ بہت ہے مجھ میں

میں چاہوں مرے دل کا لہو کسی کام آجائے
موسم چاہے چہروں کو گلفام نہ رکھنا

بارش سنگ ہی جب میرا مقدر ہے تو پھر
اے خدا ! شاخ ثمردار بنا دے مجھ کو

عرفانؔ صدیقی نے جزا و سزا، آخرت و عافیت اور اعتقادات کی بھول بھلیوں میں کبھی اپنے کو نہیں الجھایا۔ دنیا کا کوئی بھی ازم عظمت انسانی سے بڑا نہیں ہوسکتا کیونکہ دنیا کا ہر ازم ہر مسلک ہر مذہب انسان کا محافظ اور اس کی خوشحالی کا ضامن ہوتا ہے اس لئے کسی بھی ازم کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ انسانی اقدار کو پامال کرے۔ شاعر ہو یا ادیب، مصور یا مغنی، فلسفی ہو یا سائنسداں کوئی بھی بڑا فنکار کسی ازم کی تابع داری نہیں کرتا وہ صرف انسانی اقدار کا پابند اور تابع دار ہوتا ہے۔ عرفانؔ صدیقی کی عظمت کی نشانیاں اس امر میں مضمر ہیں کہ وہ اس زمین پر صالح اور نیک انسانوں کا اقتدار چاہتے ہیں۔

عرفانؔ صدیقی اپنے اشعار سے، گفتار و کردار سے، تحریر و تقریر سے کبھی ایسا محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ ہم میں سے نہیں ہیں یا وہ ہم سے مختلف ہیں۔ وہ اسی زمین کے باشندے ہیں اور ان کے پاؤں ہمیشہ اسی زمین پر ٹکے رہتے ہیں۔ غیر ضروری فلسفہ کے تیر و نشتر سے ان کی شاعری مجروح نہیں ہوتی ان کے افکار مابعد الطبیعاتی کشمکش سے پاک

ہیں۔وہ ہمیشہ اسی زمین پر بسنے والوں کی باتیں سوچتے ہیں اور کہتے ہیں امن وشانتی کی باتیں،خوشحالی اور بہتر عقل کی باتیں۔وہ ایک ایسی دنیا کے متمنی ہیں جہاں ناانصافی نہ ہو جہاں انسان سکھ،شانتی اور وقار کے ساتھ جی سکے،جہاں استحصال نہ ہو جہاں کی دولت اور پیداوار پر مٹھی بھر خودغرض لوگوں کی اجارہ داری نہ ہو،جہاں انسان کو انسان کی اطاعت اور حلقہ بگوشی پر مجبور نہ ہونا پڑے۔وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ایک ایسے سماج کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں جہاں صرف محبت ہی محبت ہو،دوستی اور اخوت ہو انسانیت اور ہمدردی ہو، عداوت اور دشمنی سے انہیں سخت نفرت ہے وہ ملک کی یک جہتی اور انسانی رشتے کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔وہ محبوب کے خلوت کدے میں بھی آزادی وخودمختاری کا خیال باقی رکھتے ہیں۔وہ حسن کی پرستش اور اس کی پذیرائی کے ساتھ ساتھ عورت کی آزادی اور سماجی مرتبے کے بھی طرفدار ہیں:

میں نے اتنا اسے چاہا ہے کہ وہ جان مراد
خود کو زنجیر محبت سے رہا چاہتی ہے

میرے اندر کا ہرن شیوۂ رَم بھول گیا
کیسے وحشی کو گرفتار کیا ہے اس نے

اس تجزیاتی مطالعہ کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ عرفان صدیقی نے جہاں نئے موضوعات ومسائل کی ترجمانی کی وہیں ایک نیا ڈکشن (Diction) بھی ایجاد کیا اور انھوں نے پرانی علامتوں کو نئے مفاہیم سے روشناس کرایا۔ نئے استعارے اور نئی ترکیبیں وضع کیں بقول پروفیسر محمد حسن:

''عرفان صدیقی کی غزلوں کی کوملتا اور پاکیزگی اور......ان کے شعروشعار میں ذات اور کائنات کی سرحد پر سفر کی خو اور غزل کو روایتی علامتوں اور آرائش گل بوٹوں سے آزاد برتنے کا انداز،سخن فہموں کی توجہ چاہتا ہے کہ ممکن ہے انہی اسالیب میں کہیں کل کا سورج چھپا ہو،گذرے ہوئے کل کا نہیں آنے والے کل کا۔''

(غزل کا تخلیقی سفر بحوالہ معاصر اردو غزل،ص ۲۲ قمر رئیس،دہلی)

جب ان ساری باتوں کا احاطہ کیا جائے گا تو یہ کہنا پڑے گا کہ عرفانؔ صدیقی نے ہماری شاعری کو ایک نئی زبان دی ہے جو ہر چند کہ ہماری ادبی روایت سے مربوط اور مستفید ہے تاہم نئی بھی ہے۔

عرفان صدیقی کی مخصوص لفظیات وعلامات

اور
غزل میں ان کی معنویت کا جائزہ

پانچویں اور ساتویں دہائیوں کے دوران اردو شاعری کے منظرنامہ پر جو شعراء ظاہر ہوئے ہیں ان میں عرفان صدیقی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں خصوصا ستر کے دہے میں جو شعر وادب میں فکروفن کے نئے جہات وابعاد روشن ہوئے ہیں اور طرز احساس کے جو نئے پیرائے سامنے آئے ہیں ان میں یقیناً دوسروں کا بھی ہاتھ ہے لیکن نئی نسل کے ادیبوں اور شاعروں نے جس شعری رویے اور فنی نہج کا عام طور سے ساتھ دیا ہے یا اثر قبول کیا ہے خواہ وہ شعوری ہو یا غیر شعوری اس کا بیشتر تعلق عرفان صدیقی سے ہے انھوں نے اردو کی عظیم شعری روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہوئے خیال اور اسلوب دونوں حوالوں سے غزل میں مضامین نو اور لفظیات کے ایسے تجربے کئے جو نئی نسل کے شاعروں کو ایک نئے ذائقہ کا پتہ دیتے ہیں۔ عرفان صدیقی اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہیں کہ کسی بھی تخلیقی فن پارے میں الفاظ کے معانی سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے اس کا وجود الفاظ سے علیحدہ ایک صوتی پیرایہ کی صورت میں شعر کی معنویت کو دوچند کر دیتا ہے لہٰذا عرفان صدیقی نے الفاظ کے معنوی امکانات کو روشن کرنے کیلئے انہیں صیرفی سخن پر مختلف زاویوں سے پرکھا اور دیکھا ہے۔ وہ شاعری کو الہامی شئے نہیں سمجھتے بلکہ اسے خالص شعوری عمل مانتے ہیں اور لفظ کو برتنے کی اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں شاعری میں الفاظ کے حسن استعمال پر گفتگو کرتے ہوئے ایک موقع پر پروفیسر نیر مسعود نے فرمایا تھا کہ:

''عرفانؔ صدیقی کو جو چیز ان کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے وہ الفاظ کا رموز واسرار ہے یہ بات میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح الفاظ کے رمز وایما کو انھوں نے سمجھا ہے اس طرح ان کے ہم عصر شعراء میں بہت کم شاعروں نے سمجھا ہے۔''

(انٹرویو/مرزا شفیق حسین شفق)

عرفانؔ صدیقی کا کمال شاعری یہ ہے ان کے مخصوص الفاظ ہی ان کی مخصوص علامتیں ہیں۔ مثلاً تیغ، تیغ جفا، سر، نیزہ، نوکِ نیزہ، تیر، گلو، لہو، موج، موج خوں، قتل، قاتل، مقتل، پرندہ، شجر، شاخ، شاخِ شجر، پھول، سرخ پھول، ہوا، موجِ ہوا، جنگل، شہر، گھر، دشت وحشت، دل زدگان، کشتگان، گمشدگان وغیرہ ہماری شاعری میں شروع سے مستعمل ہیں یہ اور اسی قسم کے دیگر الفاظ کثرتِ استعمال کی وجہ سے اس قدر عامیانہ ہو گئے ہیں کہ بظاہر ان میں کوئی نیا پن نظر نہیں آتا لیکن عرفانؔ صدیقی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ایسے الفاظ کا اپنی غزلوں میں استعمال اس خوش اسلوبی سے کیا ہے کہ قاری ان کو پڑھ کر چونک اٹھتا ہے اس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ الفاظ جو کثرت استعمال کی وجہ سے اپنی آب وتاب کھو چکے ہیں کیا ان میں اتنا دم خم ہے کہ ان سے شاعر نئے نگار خانے سجا سکے؟ عرفانؔ صدیقی نے روایتی الفاظ کو اپنی غزلوں میں نئے فنکارانہ حسن کے ساتھ استعمال کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر پرانی چیز بے روح نہیں ہوتی۔ اگر شاعر کا فن پختہ وبالیدہ ہے اور شاعر الفاظ کا تخلیقی استعمال کرنا جانتا ہے تو الفاظ نئے ہوں یا پرانے وہ کارآمد ہیں۔ ان کی بنیاد پر ایسی شاعری کی جا سکتی ہے جس میں جدت وندرت ہوتی ہے۔ اصل معاملہ تخیل اور نظریہ سے تعلق رکھتا ہے اگر تخیل دقیانوسی اور نظریہ فرسودہ ہو تو نئی لفظیات بھی شاعر سے کوئی بڑا شعری کارنامہ انجام نہیں دلا سکتی۔ عرفانؔ صدیقی کی شاعری اپنے معاصرین سے منفرد اسی لئے ہے کہ ان کے یہاں الفاظ پرانے ہیں مگر خیالات نئے ہیں۔ درج شدہ الفاظ وعلامات پر مشتمل چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

تیغ / تیغ جفا

واقعی کیا اسی قاتل کی طرف تو بھی ہے
تو بھی ہے اے مری جاں تیغ بکف تو بھی ہے

میں چاہتا تھا کہ کچھ سرکشی کی داد ملے
تو اب کے شہر میں تیغ جفا چلی ہی نہیں

جو دیکھئے تو نہ تیغ جفا نہ میرا ہاتھ
جو سوچیے تو کہیں زیر سنگ سا کچھ ہے

سرِ نیزہ/نوک نیزہ

اور اک جست میں دیوار سے ٹکرائے گا سر
قید پھر قید ہے دیوار کی وسعت پہ نہ جاؤ

خنجر کی طرح کاٹ بھی ہے تند ہوا میں
اب سر کی کریں فکر کہ دستار بچائیں

کوئی شے طشت میں ہم سر سے کم قیمت نہیں رکھتے
سو اکثر ہم سے نذرانہ طلب ہوتا ہی رہتا ہے

ایک خیمہ زمیں پر کھجوروں کے پاس
ایک نیزہ بلند آسمانوں کے نام

دولت سر ہوں سو ہر جیتنے والا لشکر
طشت میں رکھتا ہے نیزہ پہ سجاتا ہے مجھے

میں کہاں گلاب شجر کروں میں کشادہ سینہ کدھر کروں
کوئی نیزہ میرے یمین میں کوئی تیغ میرے یسار میں

سروں کے پھول سر نوک نیزہ ہنستے رہے
یہ فصل سوکھی ہوئی ٹہنیوں پہ پھلتی رہی

تیر/گلو

بہت حسیں تھے ہرن دھیان بٹ گیا آخر
وہی ہوا کہ مرا تیر اُچٹ گیا آخر

اپنے بھولے ہوئے منظر کی طرف لوٹ چلو
گم شدہ تیرو، کسی سر کی طرف لوٹ چلو

جو تیر بوڑھوں کی فریاد تک نہیں سنتے
تو ان کے سامنے بچوں کا مسکرانا کیا

پھراک عجیب تماشہ رہے گا صدیوں تک
یہ کارزار کمان و گلو ہے کتنی دیر

لہو/موج/موج خوں

پھر ہواؤں سے کسی امکان کی ملنا نوید
پھر لہو میں آرزوئے تازہ تر کا جاگنا

اوروں کا لہو لٹانے والے
کچھ اپنی کمائی دے تو جانوں

سجے سجائے صحیفے خراب کرتے ہیں
یہ کون لوگ ہیں جو لہو کو کتاب کرتے ہیں

یہ موج موج کا اک ربط درمیاں ہی سہی
تو کیا ہوا میں اگر دوسرا کنارہ ہوا

اک موج سے شاداب ہیں یہ دونوں کنارے
جو ہے مرے من میں ترے تن میں بھی وہی ہے

ایک رنگ آج بھی تصویرِ ہنر میں کم ہے
موجِ خوں آ، مرا دیوان مکمل کر دے

ایک رنگ آخری منظر کی دھنک میں کم ہے
موجِ خوں اٹھ کے ذرا عرصۂ شمشیر میں آ

قتل/قاتل/مقتل

کس کو دیں قتل کا الزام بڑی مشکل ہے
جو بھی قاتل ہے ہماری ہی طرح بسمل ہے

مہرباں قاتل کا ممنون کرم ہونے کو ہوں
اے غرور جاں مدد کرنا کہ خم ہونے کو ہوں

کہیں تو لٹنا ہے پھر نقد جاں بچانا کیا
اب آگئے ہیں تو مقتل سے بچ کے جانا کیا

پرندہ/

سرحدیں اچھی کہ سرحد پہ نہ رکنا اچھا
سوچئے، آدمی اچھا کہ پرندہ اچھا

اڑے تو پھر نہ ملیں گے رفاقتوں کے پرند
شکایتوں سے بھری ٹہنیاں نہ چھو لینا

پرند جھیلوں پہ آئے ہیں لوٹنے کے لئے
سبھی رکے ہوئے لشکر رکاب کرتے ہیں

شجر/شاخ/شاخ شجر

دعا کرو کہ سلامت رہے شجر کا بدن
بہار برگ و ثمر آتی جاتی رہتی ہے

اسی سفر کا شجر ہے وہ پھر ملے گا مجھے
اسی زمین کا موسم ہوں لوٹ آؤں گا میں

شاخ کے بعد زمیں سے بھی جدا ہونا ہے
برگ افتادہ ! ابھی رقص ہوا ہونا ہے

تونے کیا سوچ کے اس شاخ پہ وارا تھا مجھے
دیکھ میں پیرہن برگ بدل کر آیا

موسم گل سے کم نہ تھا موسم انتظار بھی
شاخ پہ برگ آخری رقص کناں بہت ہوا

بے نوا پتے بھی آیات نمو پڑھتے ہوئے
تم نے دیکھا ہے کبھی شاخ شجر کا جاگنا

قفس میں جس طرح چپ ہے یہ طائر
سر شاخ شجر ایسا نہیں ہوگا

میں تھک جاؤں تو بازوئے ہوا مجھ کو سہارا دے
گروں تو تھام لے شاخ شجر ایسا نہیں ہوگا

پھول/سرخ پھول

آباد نہیں اس سے فقط وصل کی بستی
وہ پھول ہے اور ہجر کے بن میں بھی وہی ہے

پھول چہروں پہ سویروں کا سماں جیسا ہے
سارا منظر مرے خوابوں کے جہاں جیسا ہے

مجھے کچھ شوق نظارہ بھی ہے پھولوں کے چہروں کا
مگر کچھ پھول چہرے میری نگرانی بھی کرتے ہیں

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر
یہ کیا پرندہ ہے شاخ شجر پہ وارا ہوا

ہوا/موجِ ہوا

بند کمرے میں پراگندہ خیالوں کی گھٹن
اور دروازے پہ اک آوازِ پا ، جیسے ہوا

کون ہے تیرگی شام کا مجرم کہ یہاں
ہے چراغوں کی طرح موج ہوا بھی خاموش

سب تیری دین ہے یہ رنگ، یہ خوشبو، یہ غبار
مرے دامن میں تو اے موجِ ہوا کچھ بھی نہ تھا

جنگل/شہر/گھر

گرگ وہاں کوئی سر نہیں کرتا آہو پر بندوق
اس بستی کو جنگل کہنا جنگل کی توہین

جنگلوں میں شہر در آئے ہیں خوشحالی لئے
پیڑ گملوں میں سمٹ جائیں گے ہریالی لئے

در و دیوار میں کچھ تازہ ہوا حل کر دے
کوئی رت آئے اور اس شہر کو جنگل کر دے

دروازوں پر دن بھر کی تھکن تحریر ہوئی
مرے شہر کی شب ہر چوکھٹ کی زنجیر ہوئی

خیر، اب میری فصیلِ شہر بھی کیا دور ہے
جنگلوں تک آ چکا پیکِ سحر سنتا ہوں میں

نہر اس شہر کی بھی بہت مہرباں ہے مگر اپنا رہوار مت روکنا
ہجرتوں کے مقدر میں باقی نہیں اب کوئی قریہ معتبر یا اخی!

اب آگئی ہے سحر اپنا گھر سنبھالنے کو
چلوں کہ جاگا ہوا رات بھر کا میں بھی ہوں

خاک میں اس کی اگر خون بھی شامل ہے تو کیا
یہ مرا گھر بھی تو ہے کوچۂ قاتل ہے تو کیا

زندہ رہنے کی خوشی کس لاش سے مل کر مناؤں
کس کھنڈر کو جا کے مژدہ دوں مرا گھر بچ گیا

دشت/وحشت

دیکھیے جو دشت زندہ ہے رمِ آہو سے ہے
سوچیے وہ شہر کیا ہوگا جہاں میں ہی نہیں

ریت پر تھک کے گرا ہوں تو ہوا پوچھتی ہے
آپ اس دشت میں کیوں آئے تھے وحشت کے بغیر

وادئ ہو میں پہنچتا ہوں بیک جستِ خیال
دشت افلاک مری وحشت جاں سے کم ہے

وحشت کے ساتھ دشت مری جان چاہیے
اس عیش کے لئے سروسامان چاہیے

جنوں کے فیض سے چرچا بتوں میں وحشت کا
خدا کے فضل سے موضوعِ گفتگو ہم لوگ

دل زدگاں/

دونوں تباہ ہوگئے ختم کرو یہ معرکے
اہلِ ستم نہیں نہیں، دل زدگاں نہیں نہیں

یہاں کوئی نہیں سنتا حدیثِ دل زدگاں
مگر میں اور طرح بات کرتا رہتا ہوں

سر ہونے دو یہ کارِ جہاں عیش کرینگے
ہم لوگ بھی اے دل زدگاں عیش کرینگے

کشتگاں/

دلوں سے درد کا احساس گھٹتا جاتا ہے
یہ کشتگاں کا قبلہ سمٹتا جاتا ہے

تیغ ستم کو جس نے عطا کی ہیں مہلتیں
فریادِ کشتگاں میں اثر بھی اسی کا ہے

ذرا کشتگاں صبر کرتے تو آج
فرشتوں کے لشکر اترنے کو تھے

گمشدگاں/

ابھی ابھی جو ستارے مرے کنار میں تھے
چمک رہے ہیں سرِ آسمانِ گمشدگاں

میں اپنی کھوئی ہوئی بستیوں کو پہچانوں
اگر نصیب ہو سیرِ جہانِ گمشدگاں

یہ بھی لکھتے ہو کہ معلوم نہیں ان کا پتا
اور خط بھی طرفِ گمشدگاں لکھتے ہو

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی کی مخصوص شعری لفظیات ہی ان کی اصل شناخت ہے۔ ان کے شعری الفاظ ایک ایسی کلید بن جاتے ہیں جس سے وہ ہر منظر اور خیال کو کھولتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا تجربہ الفاظ کو طاقت بخشتا ہے اور الفاظ اپنے لغوی معنی سے باہر نکل جاتے ہیں پھر الفاظ کا رشتہ عرفان صدیقی سے ہوتا ہے۔ وہ جس طرح اس کو تخلیقی وجود دیتے ہیں الفاظ اسی طرح حرکت میں آتے جاتے ہیں۔

کفایت الفاظ شاعری کا حسن نہیں بلکہ کمال بھی ہے اس لئے شاعر رمز و ایما کے طریقے بالعموم برتتے ہیں یعنی بیان کے ایک حصے کو حذف کر دیتے ہیں اور شعر میں ایسا اشارہ رکھ دیتے ہیں جو قاری کے ذہن کو حذف کردہ بیان کی طرف منتقل کر دیتا ہے قاری اشارہ کو سمجھ لیتا ہے سارا شعر اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔ اکہرے مفہوم کے شعر میں یہ طریقہ معمہ یا پہیلی سے مماثلت رکھتا ہے پہیلی بوجھنے کے بعد استعجاب ختم ہو جاتا ہے اور سوچنے اور محسوس کرنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔ عرفان صدیقی کے اسلوب کا خاص وصف یہ ہے کہ ان کی ایمائیت معانی کی مختلف جہات کی طرف رہنمائی کرتی ہے البتہ ان کا وہ کلام جو داخلی طور پر ان کے عمیق و تہہ دار تجربات کی استعاراتی باز آفرینی کرتا ہے مشکل ضرور ہے اور قاری کے لئے تفہیم کی دشواری پیدا کرتا ہے۔ لیکن حساس اور باذوق قاری اس دشواری پر قابو پا لیتا ہے بعض مقامات پر ان کی مشکل پسندی دراصل تجربے کی اس پیچیدگی سے منسوب ہے جس سے شاعر داخلی طور پر گزرتا ہے اور جو علامتی صورت گری سے ابہام کو راہ دیتی ہے اور ابہام سے سادہ الفاظ پر مبنی اشعار بھی مشکل پسندی کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔ ایسا کلام کسی قطعی، خارجی، یا قابل شناخت حقیقت معنی یا موضوع کو پیش نہیں کرتا بلکہ لفظ و پیکر کی انسلاکیت سے تجربے کے سیمیائی جہان خلق کرتا ہے قاری کو ان جہانوں میں وارد ہونے کے لئے لفظ شناسی کے ساتھ ساتھ اپنی قوت تفہیم، حسن مشاہدہ اور ذوق تجسس کو بروئے کار لانا لازمی ہے، عرفان صدیقی کو شعر کے اس داخلی طریقۂ کار کا علم ہے اسی لئے وہ

پیچیدہ بیانی کو سخن سادہ پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ پیچیدگی کے علاوہ سادگی وسلاست کی مثالیں بھی عرفان صدیقی کے اسلوب میں پائی جاتی ہیں لیکن وہ ان کا مابہ الامتیاز نہیں، اس سے صرف شاعر کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے اگر چہ عمدہ اشعار بھی اس طرزِ بیان میں موجود ہیں مگر عمدگی اور نفاست طرز عرفان کے خصائص نہیں۔ان کے منفرد کلام کے خواص جدتِ بیان ندرت خیال اور شوکت الفاظ ہیں۔

ہماری نئی شاعری میں پرانے الفاظ کی جگہ نئے لفظیاتی نظام نے لے لی ہے اور ہمارے نئے شاعر خوش آہنگ اور بامعنی ترکیبیں تراش رہے ہیں اور الفاظ کی علامتی قوت کو پوری طرح سمجھ رہے ہیں۔یہ بہت سے قدیم اور عمدہ الفاظ کو محض بے جواز عدم استعمال کی وجہ سے نظر انداز کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں پرانے الفاظ ہماری شاعری سے رخصت ہوتے جارہے ہیں۔عرفان صدیقی از سرِ نو ان میں معنی کی روح داخل کر کے دوبارہ زندہ کر رہے ہیں، مثلاً ابدال،قلندر، سلوک، ارزانی، نواح، قریہ،ناحیہ، پیک، مجرائی، قبالہ، چاکر، خرابہ،حرف زن، نگارندہ، مصاف، دار، غرفہ،نیم رس ،طرفہ ،معمورہ ،کوچہ گرد، اخی، منعم، رہوار، فرس، جنگاہ، شقی، مملکت ارزانی ہونا،شہروں کا آثار کرنا وغیرہ۔عرفان صدیقی انہیں اپنی شاعری میں کلاسیکی رنگ پیدا کرنے کے لئے استعمال نہیں کرتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر خود انہیں اپنے لئے ڈھونڈ کر لاتے ہیں اور لفظوں سے ان کے تعلق کو اچھی طرح جانچ کر انہیں اپنے کلام میں جگہ دیتے ہیں۔عرفان صدیقی جب تک لفظوں کے ممکنہ معنوی امکانات پر غور وفکر نہیں کر لیتے ہیں تب تک انہیں استعمال نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ ان کے استعمال کردہ الفاظ پتھر کی لکیر بن جاتے ہیں بقول پروفیسر نیر مسعود:

> ''اپنے بالواسطہ اور اشاراتی بیانئے کے لئے وہ اتنے کامل اور مناسب محل الفاظ چنتے ہیں کہ ان کے المیہ شعر بھی ایک طرف محزونی کا اثر پیدا کرتے ہیں اور دوسری طرف وہ جمالیاتی مسرت بھی دیتے ہیں جو ہر عمدہ فن پارے سے حاصل ہونی چاہئے۔عرفان صدیقی کی شعری زبان ایک علیحدہ اور تفصیلی مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔نئی نئی ترکیبیں وضع کرنے کے لحاظ سے ان کے ہم عصروں میں ان کے ہم سرکم

ملیں گے......ان کی زبان کا سب سے ممتاز اور قابل ذکر وصف یہی ہے کہ ان کے شعر کے کسی لفظ کو اپنی جگہ سے ہلایا نہیں جا سکتا میر انیسؔ نے ایک ملاقات میں محمد حسین آزادؔ کو اچھے شاعر کی یہی پہچان بتائی تھی۔ ''جو لفظ جس مقام پر اس نے بٹھا دیا ہے اسی طرح پڑھا جاوے تو ٹھیک ہوتا ہے نہیں تو شعر رتبے سے گر جاتا ہے۔'' عرفانؔ صدیقی کی یہی پہچان ہے کہ ان کا شعر کبھی رتبے سے نہیں گرتا اور ہمیشہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔'' (انٹرویو/مرزا شفیق حسین شفق)

پروفیسر نیر مسعود کے اس قول کی روشنی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عرفانؔ صدیقی نے الفاظ کے رموز واسرار کو پوری طرح سمجھ لیا ہے اور وہ الفاظ کی گہرائی و گیرائی کی تلاش کو اپنا بنیادی فریضہ سمجھتے ہیں۔ عرفان صدیقی بسیار گو، زود گو، اور بدیہہ گو شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ فیضؔ کی طرح ہفتوں مصرعوں کو سنوارتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اپنے معاصرین کے مقابلہ میں ایک اعتبار سے مختصر ہے مگر جو کچھ بھی ہے وہ منتخب ہے ایسا منتخب کہ ان کے کلام سے انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہر شعر اپنے آپ میں مکمل ہے اس کے باوجود بھی ان کے بعض اشعار پر ادبی حلقوں میں اعتراضات ہوتے رہے ہیں مثلاً ان کا ایک بہت مشہور شعر ہے:

کم سے کم ایک روایت تو ابھی زندہ ہے
سروہی ہوں کہ نہ ہوں سنگ ملامت ہے وہی

اس شعر سے متعلق معترضین کی چہ می گوئیاں سننے میں آتی رہتی ہیں۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ ''سروہی ہوں کہ نہ ہوں سنگ ملامت ہے وہی'' کا مطلب یہ ہوا کہ مظلوم ہوں یا نہ ہوں مگر ظالم آج بھی پائے جاتے ہیں اور یہ کیا کم ہے کہ ظالموں کا وجود اب بھی باقی ہے گویا اس شعر میں ظلم اور ظالم کے وجود کی بقا کو فعل مستحسن قرار دیا گیا ہے یہاں ''سنگ ملامت''، ظلم اور سر مظلومی کے استعارے کے طور پر آئے ہیں لہٰذا ''کم سے کم'' کے ٹکڑے سے شعر میں لسانی خامی پیدا ہو گئی ہے، کیونکہ ''کم سے کم'' کا استعمال اردو ادب میں غنیمت کے معنی میں ہوتا رہا ہے مثلاً کہا جائے کہ گجرات کے حالیہ فسادات نے وہاں کے مسلمان روساء کی کمر توڑ دی ہے ساری دولت فسادات کی نذر ہو چکی ہے مگر کم

سے کم یہ کیا کم ہے کہ گزر اوقات کے لائق تو بچ گئی ہے لہٰذا اس لحاظ سے شعر کی قرأت کی جائے تو گویا شاعر ظلم کے قیام کا خواہش مند نظر آتا ہے اور اسے اس کے خاتمہ کی فکر نہیں ہے بلکہ وہ بقائے ظلم پر اطمینان کا اظہار کر رہا ہے۔

معترضین نے دراصل عرفان صدیقی کے اس شعر کو سمجھنے میں بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ اس کی تفہیم ''علامات کربلا'' کے آئینہ میں کی ہے جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ عرفان صدیقی کے یہاں صرف علامات کربلا ہی نہیں بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے وہ تو صرف ان کی شاعری کا ایک پہلو ہے حالانکہ یہ شعر خالص عشقیہ شعر ہے ''سنگ ملامت'' کی ترکیب کی موجودگی میں کربلا کا تو تصور بھی محال ہے۔ ''سنگ'' اور ''سر'' کی علامت ہماری اردو شاعری میں ابتداء سے استعمال ہوتی چلی آ رہی ہے۔

اس شعر کو عشقیہ شاعری کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے گی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے سر پہلے، دوسری طرح (باوقار) تھے اور ہم پر سنگ ملامت پڑتے رہتے تھے مگر اب وہ روایت اس لئے باقی نہیں رہی کہ اب ہمارے سر اس طرح (باوقار) نہیں رہے یعنی ہم میں وہ شان باقی نہیں رہی لیکن ملامتیں اسی طرح سے پڑ رہی ہیں جیسے پہلے پڑ رہی تھیں۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ ''سنگ ملامت'' عشق کی ملامت ہے دیوانے پر پتھر مارنے کی روایت بہت پرانی ہے دیوانہ پر پتھر عشق کی وجہ سے مارے جاتے ہیں مگر اب ایسے سودائی کہاں ہیں جو عشق کی راہ میں درپیش مشکلات کا سامنا کر سکیں، اس شعر کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ معاصر عہد میں نہ وہ سر ہیں اور نہ وہ سودائی ہیں مگر وہی ملامتیں ہم پر آج بھی پڑ رہی ہیں یعنی عام طور پر ہمارا جو انداز تھا اب وہ نہیں رہا اور ہمارے سر میں وہ سودا بھی نہیں رہا مگر دشمن اب بھی ہم پر ملامت کر رہے ہیں۔ یہاں ملامت سے مراد صرف ملامت نہیں بلکہ مخالفانہ کارروائیاں ہیں جو اب بھی ہمارے خلاف ہو رہی ہیں اگرچہ اس قابل نہیں رہے کہ ہماری مخالفت کی جائے یا ہم سے دشمنی کی جائے ہم تو خود ہی تباہ حال ہو رہے ہیں۔ ملامت کے دوسرے معنی عشق یا مقصد کی لگن ہو سکتے ہیں جو اب پہلے جیسی نہیں رہی ہے ہمارے اس خیال کی توثیق عرفان صدیقی کے دیگر اشعار سے

بھی ہو جاتی ہے ''سنگ ملامت'' کی ترکیب ان کے یہاں بار بار استعمال ہوئی ہے اس نوع کے دو شعر اور ملاحظہ فرمائیں:

سرو قامت نہ سہی سنگ ملامت ہی سہی
سر ملا ہے تو کسی چیز پہ وارا جائے

تم سمجھتے ہو جسے سنگ ملامت عرفاںؔ
کیا خبر وہ بھی کوئی رسمِ پذیرائی ہو

عرفاںؔ صدیقی کے اشعار میں اکہرے معنی بہت کم ہوتے ہیں ان کے اشعار میں معنی کے مختلف جہات ہوتے ہیں جن کی تفہیم ہر ایک قاری کے بس کی بات نہیں ہے۔ عرفان صدیقی کے اشعار کو سمجھنے کے لئے عمیق مطالعہ اور وسیع مشاہدہ کی ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے کہ ناقدین کی زبان و بیان کے معاملہ میں اتنی زیادہ سخت گیری بھی مناسب نہیں ہے، زبان و بیان سے واقفیت شاعر کے لئے ضروری ہے اس کے بغیر شعر میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا قواعد (Grammer) کو نظر انداز کرنا زبان کو قتل کرنے کے مترادف ہے لیکن قواعد کو زبان پر تھوپ دینا بھی زبان کی توسیع واشاعت اور اس کے فروغ کی راہ میں روڑے اٹکانے کے برابر ہے، شعر گوئی کا فن بہت نازک اور لطیف فن ہے یہ اکثر قواعد کی جکڑ بندیوں کا متحمل نہیں ہو پاتا شعر کہتے وقت شاعر پر الہامی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ اپنے مخصوص وجدانی لمحات میں اکثر زبان و بیان کی بیجا حدود وقیود کو توڑ دیتا ہے خود اقبالؔ کے یہاں یہ عمل ملتا ہے میر و غالبؔ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے سنا ہے کہ شیکپیئر نے بھی بہت سی قواعد کی غلطیاں کیں ہیں اور جب اس کو اس کی غلطیوں پر ٹوکا گیا تو اس نے یہ کہہ کر اپنے نکتہ چینوں کے دانت کھٹے کر دیئے کہ قواعد میرے محکوم و پابند ہیں، میں قواعد کا محکوم و پابند نہیں کیونکہ جو عہد ساز شاعر ہوتے ہیں وہ قواعد کے بندھے ٹکے اصولوں کے تابع نہیں ہوتے بلکہ وہ جس طرح سے زبان کو استعمال کرتے ہیں اس کے بعد وہی قواعد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

عرفانؔ صدیقی دور حاضر کے ایک رجحان ساز شاعر ہیں ان کو ضابطوں اور اصولوں کی مٹھی میں بند کر کے دیکھنا دکھانا بہت مشکل ہے خواہ یہ ضابطے اور اصول نئے ہوں یا پرانے البتہ ان کے فن کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کیلئے ضابطوں سے کام لینا پڑا تو پھر یہ ضابطے خود عرفانؔ صدیقی کے فنی رویوں سے اخذ کرنے ہونگے وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری، طرز احساس، فکر اور فنی برتاؤ ہر لحاظ سے ہماری شاعری کے ماضی اور حال دونوں سے اتنی مختلف ہے کہ نقد و نظر کے مروجہ اصول ان کی پرکھ کے لئے زیادہ کار آمد نہیں ہو سکتے۔

●●●

چوتھا باب

عرفانؔ صدیقی اور علامات کربلا:

- واقعۂ کربلا کی اہمیت و معنویت
- واقعۂ کربلا کے معنوی اقدار
- واقعۂ کربلا کی علامتی قوت
- عرفانؔ صدیقی کی شاعری میں علامات کربلا کی مخصوص اور معاصر معنویت

واقعۂ کربلا کی اہمیت و معنویت

عرب میں تاریخ اسلام سے قبل ذریت اسماعیل میں مجاور کعبہ عبد مناف کی شخصیت اپنے بعض خصوصیات کی بنا پر مرکزیت کی حامل رہی ہے ان کے چار بیٹے تھے جن میں دو بیٹوں کا نام عبد الشمس اور ہاشم تھا دونوں مزاجی اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد تھے لہٰذا دونوں کے درمیان زبردست نفاق وشقاق پیدا ہو گیا عبد مناف کی وفات کے بعد مخالفت ومخاصمت کی یہ آگ اس وقت اور بھی تیز ہوگئی جب اہل قریش نے ہاشم کو خانہ کعبہ کا مجاور بنادیا۔ ہاشم کے مجاور کعبہ بننے پر عبد الشمس نے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کیا گویا قابیل کی سنگدلی کی داستان کو از سر نو زندہ کر دیا۔ عبد الشمس کو ضد یہ تھی کہ ہاشم نے چھوٹے ہو کر اپنی صلاحیت ولیاقت اور بے پناہ داد و دہش سے قوم کی سرداری وپیشوائی کیسے حاصل کر لی اور قوم نے خانہ کعبہ کے انتظامات اس کے سپرد کیسے کر دیئے یا ہاشم نے روم کے قیصر اور حبشہ کے نجاشی سے اس قدر گہرے دوستانہ مراسم کیسے قائم کر لئے کہ ہاشم کے اثر ورسوخ سے عربوں کو تجارتی مراعات حاصل ہوگئیں۔ ہاشم کے عروج اور وقار کو بڑھتا ہوا دیکھ کر عبد الشمس کے حسد کی آگ اور بھڑک اٹھی بالآخر ایک دن اسے حسد کی آگ نے جلا کر خاکستر کر دیا۔ عبد الشمس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا امیہ اس کا جانشین ہوا ہاشمی عداوت اسے ورثہ میں ملی تھی اس نے چچا پر سبقت حاصل کرنے کے لئے مناظرہ کیا۔ ثالث قبیلہ خزاعہ کا ایک کاہن تھا امیہ کو اس مناظرہ میں شکست فاش ہوئی اور شرائط کے مطابق اسے ہاشم کو پچاس اعلیٰ درجہ کے اونٹ دینے پڑے اور ساتھ ہی دس سال کے لئے جلاوطن

ہو کر شام جانا پڑا، امیہ کی مسلسل ناکامیوں نے مخالفت کے شعلوں کو وقتی طور پر ٹھنڈا کر دیا مگر اس دن سے عداوت کی جڑیں اور مضبوط ہو گئیں۔

ہاشم کے بعد ان کے بیٹے عبد المطلب اور عبد المطلب کے بعد ان کے بیٹے ابوطالب خانۂ کعبہ کے مجاور بنائے گئے، ہاشم کے شمائل و خصائل انہیں ورثہ میں ملے تھے انھوں نے بھی مجاوری کے فرائض کچھ اس طرح انجام دیئے کہ تمام عرب ان کے گرویدہ ہو گئے اور انہوں نے ہاشمی عظمت و رفعت کو مزید استحکام بخشا۔ امیہ اور اس کے بیٹے حرب نے موروثی عداوت کے سبب عبد المطلب اور ابوطالب کے سر سے مجاوری کا تاج اتارنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے جس کے نتیجہ میں رنجشیں اور عداوتیں بڑھتی ہی چلی گئیں۔

اس کے بعد ہاشم کی چوتھی پشت میں حضرت محمد مصطفیٰؐ پیدا ہوئے اور ان کے مقابلہ پر حرب کا بیٹا ابوسفیان سامنے آیا لیکن مصطفوی اعجاز کے سامنے سارے عرب کی گردنیں جھک گئیں اور آخر میں ابوسفیان نے بھی مصطفوی فتوحات کے سامنے سپر ڈال دی۔ محمد مصطفیٰؐ کی وفات کے بعد ہاشمی روایات کے امین حضرت علیؑ قرار پائے اور اموی روایات کے وارث معاویہ۔ حضرت علیؑ سے معاویہ نے بہت سی جنگیں لڑیں اور ہر جنگ میں ہزیمت اٹھائی کیونکہ حضرت علیؑ علم و ہنر میں طاق اور فنون جنگ میں مشاق تھے۔ جب معاویہ نے دیکھا کہ تیر و شمشیر سے مقصد میں کامیابی کے امکان نہیں، تو اس نے عیاری اور مکاری کو اپنا شعار بنا لیا اور ۴۰ ھ میں حضرت علیؑ کو مسجد کوفہ میں سجدے کی حالت میں قتل کرا دیا۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد حضرت علیؑ کے بیٹے امام حسنؑ کو مسلمانوں نے اپنا خلیفہ تسلیم کر لیا۔ معاویہ نے امام حسنؑ سے صلح کر کے کچھ شرائط پر حکومت حاصل کر لی اور امام حسنؑ کو حکومت ظاہری سے بے دخل کر کے شرائط صلح کی علانیہ خلاف ورزی شروع کر دی معاویہ نے امام حسنؑ کے تقدس اور روحانیت سے خوف زدہ ہو کر انہیں بھی ۵۰ ھ میں زہر سے شہید کرا دیا۔

معاویہ نے صلح نامہ کے خلاف اپنے بد کردار بیٹے یزید کو اپنا جانشین اور خلیفۃ المسلمین قرار دیا۔ معاویہ کے انتقال کے بعد یزید تخت نشین ہوا۔ شراب و کباب، غنا و زنا جس کے محبوب

مشاغل تھے یزید نے برسرِ اقتدار آتے ہی حاکم مدینہ کو پروانہ بھیجا کہ امام حسینؑ سے بیعت طلب کی جائے اگر وہ بیعت کرنے سے انکار کریں تو انہیں قتل کر دیا جائے، ادھر یزید کے حاکم بننے سے تمام مسلمانوں میں ایک خلفشار تھا لوگ مختلف مقامات سے امام حسینؑ کو خطوط لکھ رہے تھے اور اپنی ہدایت کے لئے بلا رہے تھے سب سے زیادہ خط کوفے سے آرہے تھے۔ اہل کوفہ ہدایت کے خواستگار تھے۔ مدینہ کے گورنر ولید نے امام حسینؑ کو یزید کا فرمان سنایا امام حسینؑ نے اپنی عزت و آبرو کو خطرے میں دیکھ کر اپنے مختصر سے خانوادے کے ساتھ مدینہ سے مکہ کی راہ لی۔ مکہ کے لئے روانہ ہونے سے قبل حسین ابن علی ابن ابی طالبؑ ابن عبدالمطلب ابن ہاشم ابن عبد مناف نے اپنے بھائی محمد حنفیہ کے نام ایک وصیت نامہ تحریر کیا جس میں درج ہے:

"............ حسینؑ فرزند علیؑ یہ وصیت اپنے بھائی محمد حنفیہ کے حوالے کر رہا ہے وہ گواہی دیتا ہے کہ خدا کا کوئی شریک نہیں، وہ خدائے وحدہ لاشریک ہے۔ محمدؐ! اللہ کے بندے اور رسول ہیں، آئین اسلام جو آنحضرتؐ پر نازل ہوئے حق ہیں جنت و جہنم حق ہے اور روز قیامت بہر حال آکر رہے گا، بھیا! نہ میں خود خواہی کے لئے وطن چھوڑ رہا ہوں اور نہ ہی خوش آئند مستقبل کی جستجو میں اور نہ شر و فساد کی خاطر بلکہ اس سفر سے میرا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اچھائی کی دعوت دوں اور برائی سے روکوں......"

عرض کیا جا چکا ہے کہ اہل کوفہ امام حسینؑ کو مسلسل خطوط لکھ رہے تھے جب انہیں امام حسینؑ کے مکہ معظمہ میں قیام کا علم ہوا تو انہوں نے مکہ بھی خطوط ارسال کئے یہاں تک کہ کوفیوں کے خطوط کا انبار لگ گیا مگر سابقہ حالات کے پیش نظر امام حسینؑ کو کوفیوں پر اعتماد میں تردد تھا لہٰذا امام حسینؑ نے اپنے ابن عم مسلم ابن عقیل کو اپنا ایلچی بنا کر کوفے بھیجا کہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر انہیں مطلع کریں۔ ابھی کوفے سے کوئی اطلاع بھی نہیں ملی تھی کہ مکہ میں حاجیوں کے لباس میں ایک یزیدی دستہ امام حسینؑ کو قتل کرنے کیلئے پہنچ گیا۔ امام حسینؑ نے مکہ میں اپنے قتل کا سامان دیکھ کر کوفے کی طرف رخ کیا۔ ادھر کوفیوں نے مسلم ابن عقیل کی زبردست پذیرائی کی، یزید کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے ایک قسی القلب شخص

عبیداللہ ابن زیاد کو کوفہ کا گورنر بنا کر کوفہ بھیج دیا۔ اس نے کوفے میں مسلم کا انتہائی بے رحمی سے قتل کرا دیا اور ان کے میزبان ہانی کو بھی پھانسی کے پھندے پر چڑھا دیا۔ کوفیوں کی وفاداری میں اتنی استواری کہاں تھی کہ وہ ان مصائب کی تاب لا سکتے۔ بالآخر کوفیوں نے امام حسینؓ سے بے وفائی کی اور ابن زیاد نے ایک ہزار کے دستہ کے ساتھ حر کو امام حسینؓ کی تلاش میں بھیجا۔ بہر کیف حر امام حسینؓ کو تلاش کر لیتا ہے اور ایک منزل پر دونوں کی ایک دوسرے سے ملاقات ہو جاتی ہے اس وقت حر اور حر کا لشکر شدت عطش سے جاں بلب تھا ۔امام حسینؓ خود اپنے ہاتھوں سے حر اور حر کے لشکر کو پانی پلا کر سیراب کرتے ہیں المختصر دوسری محرم کو یہ کارواں کربلا پہنچتا ہے امام حسینؓ کے خیمے نہر فرات کے قریب نصب ہوتے ہیں۔ تیسری محرم کو ایک اور رسالہ عمر ابن سعد کی ماتحتی میں کربلا پہنچتا ہے اس کے بعد یزیدی فوج کی آمد کا تانتا بندھ جاتا ہے تمام راستے بند کر دئے جاتے ہیں خیام حسینی فرات کے کنارے سے اکھاڑ دیئے گے اور امام حسینؓ کو فوجی حصار میں لے کر یزید کی بیعت کا اصرار کیا جانے لگا۔ ساتویں محرم کو ابن زیاد نے نہر فرات پر کئی ہزار سپاہیوں کا پہرہ بٹھا دیا، حسینؓ اور انصار حسینؓ پر پانی بند کر دیا، کمسن بچے پیاس سے تڑپنے لگے، آٹھویں محرم کو ابن زیاد نے پھر پیغام بھیجا کہ اگر اب بھی بیعت کر لیں تو ہم تمام ایذا رسانیوں سے دست بردار ہو جائیں گے مگر ان سخت ترین مصائب و آلام کے باوجود امام حسینؓ کے پائے ثبات میں ذرہ برابر بھی لغزش نہیں آئی کیونکہ امام حسینؓ جانتے تھے کہ میری کسی قسم کی تائید بھی یزیدی نظام کے استحکام کا ذریعہ بن جائے گی جو مجھ جیسے انسان کے لئے قطعی طور پر ناجائز ہے اس لئے آپ آخر وقت تک اپنے موقف پر قائم رہے۔ امام حسینؓ نے ایک فاسق و فاجر شہنشاہ کی بیعت سے انکار کر کے اپنے زریں اصولوں کا سودا نہیں کیا مگر وہ دوسری طرف خوں ریزی سے بچنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے رہے اور گفت و شنید سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے زیادہ مصالحانہ اور منصفانہ طریقہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ امام حسینؓ نے عمر سعد کے سامنے تین باتیں رکھیں: (۱) مجھے ارض حجاز سے دور کہیں گوشہ نشین ہو جانے دو اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو (۲) مجھے مملکت اسلامی کی سرحدوں سے باہر ہندوستان یا کسی اور ملک میں چلا

جانے دو (۳) یا مجھے اپنے بادشاہ کے پاس لے چلو میں براہ راست اس سے گفتگو کر کے مسئلہ کو حل کرلوں گا۔ عمر سعد نے ان تینوں صورتوں سے ابن زیاد کو آگاہ کیا اس نے کوئی بات منظور نہیں کی اور شمر کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ کربلا کے لئے روانہ کر دیا کہ یا تو حسینؑ سے بیعت لے لو یا حسینؑ کا سر قلم کردو۔

نویں محرم کی شام کو ابن زیاد کا یہ حکم امام حسینؑ کو سنایا گیا امام حسینؑ نے ایک شب کی مہلت مانگی اور شب عاشورا اپنے تمام ساتھیوں کو ایک خیمہ میں جمع کر کے شمع گل کر دی اور کہا کہ دیکھو یہ لشکر میرے خون کا پیاسا ہے انہیں تمہارے سروں سے کوئی سروکار نہیں ہے لہٰذا میں تمہیں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ تم رات کے اس پردہ میں جہاں چاہے چلے جاؤ اور اپنی جانوں کو محفوظ کرلو اگر تمہیں یوں جاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہو تو میرے خانوادے کے افراد کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ امام حسینؑ کے اعلان پر شور گریہ بلند ہونے لگا اور ایک شخص بھی خیمہ سے باہر نہیں گیا۔ اس طرح مہلت کی شب گزر گئی، صبح عاشور نمودار ہوئی اور حر صبح عاشور یزیدی لشکر سے نکل کر لشکر امام حسینؑ میں شامل ہو گئے۔ ادھر قتل امام حسینؑ کی تیاریاں ہونے لگیں ادھر امام حسینؑ اور انصار امام حسینؑ پر بھوک اور پیاس کا غلبہ بڑھ رہا ہے۔ بچوں کی العطش العطش کی دلخراش صدائیں قلب وجگر کو پاش پاش کر رہی ہیں امام حسینؑ کی نگاہوں کے سامنے اپنی اور اپنے آل وانصار کی موت، گھر کی تباہی اور ناموس کی بے ردائی اور بادیہ پیمائی کے منظر گردش کر رہے ہیں مگر یہ سخت ترین مصائب بھی امام حسینؑ کی اصول پروری، فرض شناسی، حق بیانی اور ایثار و جرأت پر اثر انداز نہیں ہو سکے۔ طبل جنگ بجنے لگے اور لشکر یزید نے اجتماعی حملہ کر کے امام حسینؑ کے تقریباً ۴۰ راصحاب کو قتل کر دیا اس کے بعد عرب کے دستور کے مطابق ایک ایک سپاہی یزیدی فوج سے نبرد آزما ہوا اور امام حسینؑ کے سارے اصحاب ایک ایک کر کے شہید ہو گئے اصحاب کے بعد امام حسینؑ کا بتیس برس کا جواں سال بھائی عباس اور اٹھارہ برس کا کڑیل جوان بیٹا علی اکبر، چودہ برس کا بھتیجا قاسم ابن حسن، نو دس برس کے کمسن بھانجے عون ومحمد اور چند قریبی عزیز بھی شہید ہو جاتے ہیں۔ امام حسینؑ خیمہ میں آتے ہیں اور سید سجادؑ کو وصیتیں کرتے ہیں بیبیوں کو صبر کی تلقین فرماتے ہیں اور خود

مقتل میں آتے ہیں۔ اچانک خیام حسینی سے شور وشین کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ امام حسینؑ خیمہ میں آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپ کا ششماہہ بچہ علی اصغر شدت عطش سے جاں بلب ہے۔ امام حسینؑ بچے کو لے کر میدان جنگ میں آئے، بچے کو ہاتھوں پہ بلند کیا اور دشمنوں کو بچے کی اس دردناک حالت کو دکھایا اور سوال آب کیا کہ اگر تم اس بچے کو چند قطرۂ آب دے دو گے تو اس کی جان بچ جائے گی۔ یزیدی سپاہی اس دل سوز منظر کو دیکھ کر منہ پھیر پھیر کر رونے لگے ابن سعد نے مشاق تیرانداز حرملہ کو حکم دیا کہ "اقطع کلام الحسین" حرملہ نے فوراً تیر سہ شعبہ چلایا تیر گلوئے علی اصغر اور امام حسینؑ کے بازو کو چھید کر باہر نکل گیا بچہ باپ کے ہاتھوں پر منقلب ہوا اور مسکرا کر جاں بحق ہو گیا۔ علی اصغر کی شہادت کے بعد حسینؑ ابن علیؑ تین دن کی بھوک و پیاس میں جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ فوج یزید نے اپنے کشتہ ہائے نجس کو دفن کر دیا اور حسینؑ و اصحاب حسینؑ کے اجسام طاہرہ کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے پامال کر کے بے گور و کفن چھوڑ دیا اور امام حسینؑ کے اہل حرم کے خیام کو نذر آتش کر کے ان کے ناموس کو اسیر بنالیا، شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر بلند کیا اور اہل حرم کو بے مقنع و چادر شتر ہائے بے کجاوہ پر بٹھایا اور امام حسینؑ کے بیمار اور ناتواں فرزند سید سجادؑ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ڈال کر پر خار راہوں اور بھرے بازاروں سے نہایت ذلت ورسوائی کے ساتھ یزید کے دارالسلطنت دمشق (شام) میں لے جایا گیا، یزید کے دربار میں امام حسینؑ کی بہن زینب نے ایک پراثر خطبہ دیا اور مقصد شہادت کی وضاحت کرتے ہوئے دین حق کی بقا کا اعلان کیا یزید نے زینب کے خطبہ کی اثر انگیزی سے گھبرا کر اہل حرم کو ایک زندان میں قید کر دیا۔

کربلا کے نواح میں خاندان بنی اسد آباد تھا اس خاندان کے افراد نے شہادت کے چند روز بعد حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کے لاشوں کو دفن کر دیا امام حسینؑ کے اہل حرم سال بھر قید رہے یزید کی بیوی ہند محب رسولؐ و آل رسولؐ تھی کوفے میں اس نے زینب سے درس بھی لیا تھا حقیقت حال سے جب وہ واقف ہوئی تو اسے شدید رنج پہنچا اس نے یزید سے کہہ کر ان بے کس قیدیوں کو رہا کرا کے مدینے بھجوا دیا۔

یہ سانحۂ کربلا کا مختصر سا خاکہ معتبر تاریخ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے جس سے سانحہ کربلا کی اہمیت ومعنویت کا کسی قدر اندازہ ہو جائے گا لیکن اس سانحہ کی صحیح قدر ومنزلت اس کے تفصیلات میں مضمر ہے۔اس مختصر مقالہ میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہے اس سانحہ کی تاریخی تفصیلات کے علاوہ تخیلی تفصیلات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ممتاز حسین جونپوری نے اس سانحہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''کربلا کی جنگ عام عالم انسانی کے مفاد کے لئے کی گئی اور حسین نے کروڑوں آنے والے انسانوں کے دل کا درد اپنے سینے میں پیدا کرلیا تھا وہ انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے لڑے۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہی درد ہر سلیم المذاق اور صحیح الفطرت انسان کے دل میں پیدا ہے ہر انسان حسین کے حادثہ کو اپنا ذاتی حادثہ سمجھتا ہے.... کربلا ایک بہترین اخلاقی اور روحانی زندگی کا عملی پروگرام ہے.....دنیا میں مختلف مذاہب اور قوم کی ہدایت کے لئے مختلف کتابیں نازل ہو چکی تھیں، نبی اور اوتار دنیا میں آچکے تھے اور زندگی کا دستور العمل بتایا جا چکا تھا مگر پھر بھی عمل کا موثر طریقہ اختیار کرنے اور اس کی تعلیم کا دلنشین عنوان معلوم کرنے کے لئے دنیا کی روح کو بڑی الجھن تھی اور اس میں بھی بڑی گتھی یزید کی عیارانہ اور انسانیت سوز زندگی نے پیدا کررکھی تھی اس لئے خدا کے سچے عاشق اور عام نوع انسان کے بہترین دل سوز اور ہمدرد امام حسینؑ اپنے کو اور چنے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کو جن پر پورا پورا بھروسہ تھا لے کر کربلا کے میدان میں آگئے، حق وباطل کفر واسلام، سرمایہ پرستی اور مزدوری ،حریت اور جبر وظلم وغیرہ کی ہمیشہ کے لئے ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی جس کی کامیابی کا راز جان ومال کی قربانی میں مضمر تھا اس طرح حسین نے حق وصداقت کو ایک دوامی زندگی بخشی اور ایسا نیا اور پر اثر طریقہ نکالا کہ انسانی عقل وخیال اور طاقت جن کی تمام دنیا پر حکومت ہے اس سے بہتر طریق عمل ایجاد کرنے اور سمجھنے سے عاجز ہیں''۔

واقعات کربلا کے دوسرے معنوی جزئیات کی وضاحت کرتے ہوئے ممتاز حسین جونپوری آگے چل کر لکھتے ہیں:

"واقعات کربلا میں عملی سبق ملتا ہے کہ کیسے آپس میں ملنا چاہئے اقلیت اکثریت کو کیسے دبا سکتی ہے۔عزیزوں کے کیا حقوق ہیں دوست کی کیا صفت ہے ظلم کیا ہے اور انصاف کسے کہتے ہیں، صبر ووفا، حلم وخلق، حفظ مراتب، ایثار، خداشناسی، اطاعت وغیرہ کا ایک خاکہ کھینچتے ہوئے اسی سرچشمۂ ابدی اور عشق کے سمندر میں حسین جا کر مل گئے جس کا وہ خود ایک قطرہ تھے۔اب پھر نہ ویسا سماں ہوگا نہ دنیا میں یہ اسباب اکٹھا ہوں گے نہ ویسے لوگ آئیں گے نہ عام فائدہ کے لئے ایسا سبق آموز معرکہ پیش آئے گا۔ ہر نبی اور اوتار نے اپنی اپنی زندگی تک کار رسالت اور عمل خیر کا پرچار کیا مگر حسین کی شہادت رات کے سناٹے میں، بیہڑ جنگل میں، خشکی وتری میں، پہاڑ کی چوٹی پر، بادشاہ کے محل میں، فقیر کے جھونپڑے میں آج تک کار پیغمبری انجام دے رہی ہے اور سائنس کی تحقیقات نے عملاً اس کو ثابت کر کے رکھ دیا کہ کربلا کے بے آب وگیاہ میدان کی چلچلاتی دھوپ میں جو نصرت حق کے لئے "ہل من ناصر ینصرنا" کی آواز آخر وقت میں امام حسین نے بلند کی تھی وہ آج بھی فضا میں گونج رہی ہے اور اب دنیا بیدار ہو کر اس صدا کا جواب دینے کے لئے کروٹ بدل رہی ہے اور یہ اسی واقعہ کی وسعت اور عالمگیر خصوصیات کا اثر ہے کہ انسانی تخیل کو اس نے ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔" ("خون شہیداں" ص ۱۷ تا ۲۰ مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۴۲ء)

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے کربلا کی عالمگیر مقبولیت وآفاقیت اور اہمیت ومعنویت کے سلسلے میں ایک مقام پر تحریر کیا ہے کہ:

"حق کی حمایت اور اصول کی حفاظت کیلئے اکثر قربانیاں دی گئی ہیں مگر جو قربانی امام حسینؑ نے کربلا میں ۱۰ محرم ۶۱ھ کو پیش کی اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

امام حسین کی شہادت نے دلوں کو بدل دیا اور خیالوں میں انقلاب پیدا کر دیا۔"

("روح انیس"، ص ۱۴، ۱۵ مطبوعہ نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۸۱ء)

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کربلا کی افادیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:

"جب تک خیر وشر اور حق وباطل کی آویزش وپیکار میں معاشروں کو نئے مطالبات

اور نئی ہولناکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یا جبر واستبداد، ظلم اور بے مہریوں کا کوئی نیا باب وا ہوتا ہے تو معاشرے یادوں کے قدیم دفینوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور تاریخی روایتوں نیز ثقافتی لاشعور کے خزینوں سے حرکت وحرارت کا نیا ساز وسامان لے کر فکر وعمل کی نئی راہوں کا تعین کرتے ہیں حق کوشی کی راہوں کی حنابندی شہیدوں کے خون سے ہوتی ہے مختلف تہذیبوں میں مثالیں اور سلسلے ہیں ہر مثال اپنی جگہ اہم اور لائق احترام ہے لیکن اسلام کی تاریخ میں بالخصوص اور انسانیت کی تاریخ میں بالعموم کوئی قربانی اتنی عظیم، اتنی ارفع اور اتنی مکمل نہیں ہے جتنی حسین ابن علی کی شہادت جو کارزار کرب وبلا میں واقع ہوئی۔'' (سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، اردو شاعری کا تخلیقی رجحان ص ۱۷، ۱۸ مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۶ء)

اس طرح رثائی شاعری کے تجزیہ کاروں اور اردو کے اہم نقادوں نے سانحہ کربلا کے وقوعوں کے معنوی جزئیات کی وضاحتوں میں ان کے اطلاقات کے دائرے کی وسعتوں کو بہت پہلے سے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا اور انہیں واقعۂ کربلا ہر عہد کی معنویتوں سے ہم آہنگ دکھائی دینے لگا۔ دیکھا جائے تو اس عظیم انسانی المیہ میں وہ تمام معنویتیں پوشیدہ ہیں جو انسان کی ظاہری اور باطنی پیکار سے عبارت ہیں انسانی اور اخلاقی اقدار کی پاسداری اور منفی اور مخالف قوتوں سے نبرد آزمائی کا ایسا منظر نامہ تاریخ کے کسی اور المیہ میں نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ خیر وشر کے ہر معرکہ میں گھوم پھر کر ہماری نگاہ اسی واقعہ کی طرف جاتی ہے اور ہم اسی واقعہ کی معنویتوں کو ان تمام مسائل کی ترجمانی کے لئے استعمال کرتے ہیں جو اس پر آشوب دور میں رونما ہو رہے ہیں ہماری شاعری کی تاریخ میں میرؔ سے لیکر عرفان صدیقی تک اس واقعہ کی معنویتوں سے کام لیا گیا ہے اور چونکہ بیسویں صدی طرح طرح کے آشوبوں اور آزاروں کی صدی رہی ہے اس لئے اس صدی میں ہم واقعہ کربلا کی ان معنویتوں کی طرف زیادہ مائل ہوئے جن سے ہم اس پورے عہد کے معاملات ومسائل کی عکاسی زیادہ بہتر طور سے کر سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ کربلا اور حسینؑ کو اقبالؔ کی شاعری میں کلیدی حیثیت حاصل ہوئی، ترقی پسند شاعری میں یہ دونوں علامتیں زیادہ نمایاں ہوئیں

اور نئی شاعری میں انہیں انتہائی پرقوت علامتوں اور روشن ترین استعاروں کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس باب میں عرفان صدیقی کی شاعری میں واقعۂ کربلا کی انہیں علامتی معنویتوں پر تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

واقعۂ کربلا کے معنوی اقدار

ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ملک عرب (عراق) میں ۱۰ رمحرم ۶۱ ھ کو کربلا کے تپتے ہوئے صحرا میں جو سانحہ رونما ہوا، اسے ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی اس کی یاد ہر دل میں تازہ ہے کسی واقعہ کی یاد کا اتنے زمانہ تک پوری آب وتاب کے ساتھ قائم رہنا اس بات پر غور وخوض کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے کہ واقعی اس واقعہ میں کچھ ایسے داخلی خصوصیات پائے جاتے ہیں جو اسے رہتی دنیا تک فراموش نہیں ہونے دیں گے۔

انسان طبعاً مسرت پسند ہے اور رنج وغم سے دور رہنا چاہتا ہے لہٰذا اگر حوادث دہر کے ماتحت اسباب غم پیدا بھی ہوتے ہیں تو وہ ان کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے شاید یہی سبب ہے کہ دنیا کی ہر قوم کا ہر تہوار کسی نہ کسی مسرت کی یادگار ہے، رنج وغم کی یادگاریں کبھی قائم نہیں کی گئیں۔ یہ صرف حسین مظلوم کی شہادت ہے جس کی یادگار غم کی صورت میں صدہا سال سے برابر منائی جارہی ہے ظاہر ہے کہ جبلت انسانی کسی بار کو عرصہ تک اٹھانے کی متحمل نہیں ہوسکتی اس غم کی یادگار کا اس طرح برقرار رہنا اس امر کا ثبوت ہے کہ واقعہ کربلا کی یاد میں انسانی زندگی کے لئے نفع بخش عناصر موجود ہیں۔

تاریخ اسلام کو ایک عرصے سے ایسے واقعہ کا شدید انتظار تھا کہ جس سے اس کی تعلیمات پوری طرح روشن ہوجائیں اور اس کی اقدار کی قدر وقیمت ظاہر ہو۔ یوں تو دنیا کا ہر واقعہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے کسی خاص مقام، کسی خاص قوم اور کسی خاص طبقہ سے

تعلق رکھتا ہے لہٰذا واقعۂ کربلا بھی عراق کی سرزمین، ہاشم کی نسل اور مسلمانوں کی جماعت سے متعلق ہے لیکن واقعہ میں آفاقیت اور وسعت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ خصوصیات اور نتائج کے اعتبار سے تمام نوع انسانی سے وابستہ ہو جائے اور اس میں مذہب وملت کی کوئی تفریق نہ رہے اس حیثیت سے دیکھا جائے تو واقعہ کربلا متعدد وجوہ سے نوع انسانی کے ارتباط کا مرکز ومحور نظر آتا ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ امام حسینؑ کی قربانی کا مقصد کوئی ایسا امر نہ تھا جو مختلف مذاہب کے نقطۂ نظر سے محل اختلاف ہو۔ یقیناً اگر امام حسینؑ کا مقابلہ کسی دوسرے مذہب کے افراد سے ہوا ہوتا یعنی اگر غیر مسلم جماعت آپ کے سامنے ہوتی تو چاہے آپ کی قربانی کتنی ہی حقانیت پر مبنی ہوتی اور آپ کو کتنے ہی ظلم کے ساتھ شہید کیا گیا ہوتا مگر وہ مذہبی جماعت جس کے مقابلہ میں آپ ہوتے اور جس کے ہاتھوں یہ مظالم برداشت کرنا پڑتے کسی حد تک آپ کے نام اور آپ کے کام سے بنائے مخاصمت ضرور محسوس کرتی اور واقعہ کربلا کے ساتھ ہمدردی میں عمومیت پیدا نہ ہو پاتی لیکن امام حسینؑ کی قربانی رسمی طور پر کسی مذہب کو مٹانے اور دوسرے مذہب کو قائم کرنے کے لئے نہیں تھی بلکہ ایک ہی دین کے ظاہری ماننے والوں میں برائیوں کو مٹانے اور اچھائیوں کو قائم کرنے کے لئے عمل میں لائی گئی تھی اور چونکہ برائی اور اچھائی کے متعلق اصولی حیثیت سے مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا یعنی ہر مذہب میں برائیاں مٹانے کے قابل اور اچھائیاں قائم کرنے کی مستحق ہیں اس لئے ہر مذہب کے لوگوں کو امام حسینؑ کے مقصد سے اتفاق ہے اور وہ قربانی حسینی کو عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ امام حسینؑ کی مظلومیت بے بسی کی مظلومیت نہیں تھی کہ جس طرح کسی صحرا میں کسی تنہا آدمی پر قذاق حملہ کر دیں اور اس کے مال واسباب کو لوٹ کر اسے قتل کر دیں، مظلوم یہ بھی ہے اور ہمدردی اس کے ساتھ بھی ہوگی مگر یہ مظلومیت غیر اختیاری طور پر ہے اس کے ساتھ کوئی عمل ایسا شریک نہیں ہے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل تعریف ہو امام حسینؑ کی مظلومیت اس نوع کی نہیں ہے۔ آپ نے دین حق کی حمایت اور صحیح اصول کی

حفاظت کے لئے ان مصائب کو برداشت کیا کہ جن کے تصور ہی سے انسانیت لرزہ براندام ہوا ٹھتی ہے۔ جس وقت حق پرستی اور حق پیروی کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں اور غلبہ اور اقتدار انسانی آزادی کا سر کچل کر اپنی غلامی کا اقرار لے رہا تھا۔ اس نازک موقع پر امام حسینؑ نے اپنے کو اور اپنے عزیزوں کو بلکہ بچوں تک کو میدان جہاد میں لا کر جبر واستبداد کا پردہ چاک کر دیا اور ثبات واستقلال، صبر وضبط، ایثار وقربانی، حق پروری اور راست کرداری کا نہایت ارفع واعلیٰ نمونہ پیش کر کے انسانی تاریخ کا بے مثال کارنامہ انجام دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ظالم سے نفرت اور مظلوم سے ہمدردی انسانی جبلت میں شامل ہے جب ہم کوئی ناول یا افسانہ پڑھتے ہیں تو دوران مطالعہ فطری طور پر کہانی کے مظلوم کرداروں سے ہمدردی اور ظالم کرداروں سے نفرت ہو جاتی ہے جبکہ ہمیں اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ یہ فقط ایک افسانہ ہے اس کے باوجود ہمیں ظالم سے نفرت اور مظلوم سے ہمدردی ہو جاتی ہے اس کے علی الرغم امام حسینؑ کی قربانی جو ایک سچا واقعہ ہے کہ امام حسینؑ پر ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ جس کی نظیر تاریخ عالم وآدم میں ناپید ہے یوں تو اکثر انبیاء، اوصیاء اور مقربین، ابنائے زمانہ کے ہاتھوں مظالم کا شکار ہوئے بہت سے بے گناہ افراد قتل کئے گئے بہتوں کا مال واسباب لوٹا گیا اور بہت سے لوگ قید ہوئے مگر بحیثیت مجموعی وہ تمام مصائب جن کا سامنا فرداً فرداً بہت سے افراد کو کرنا پڑا امام حسینؑ نے بیک وقت تنہا برداشت کئے اسی وجہ سے ان کی مظلومیت بے مثال اور قربانی لازوال بن گئی نیز اس سانحے سے بہت سے معنوی اقدار برآمد ہوئے جن میں سے کچھ اقدار کا ذکر ہم یہاں اختصار کے ساتھ کر رہے ہیں:

حریت نفس و بیداریٔ ضمیر:

حریت کا مطلب خواہش کے مطابق مطلق العنانی نہیں ہے بلکہ حریت سے مراد انسانی ضمیر کے وہ فیصلے ہیں جن پر وہ بغیر کسی قدغن کے عمل پیرا ہو سکے ان پابندیوں میں سب سے بڑی پابندی خود اپنے لذائذ اور ان چیزوں سے محبت ہے جو ضمیر کی آواز پر لبیک

کہنے سے معرضِ خطر میں آجاتی ہیں اگر انسان اپنی خواہشات اور آرزوؤں کے تقاضوں سے آزاد ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے غلام نہیں بنا سکتی، امام حسینؑ نے کربلا کے میدان میں آرزوؤں اور نفس کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق عمل کر کے ایسے ہنگام میں حریت نفس کا ثبوت دیا جس کا تصور ہی انسان کو لرزہ براندام کر دینے کے لئے کافی ہے۔

عزت نفس و خودداری:

کبھی کبھی انسانی زندگی میں ایسے حالات بھی سامنے آتے ہیں کہ جب موت سے بہتر زندگی اور زندگی سے بہتر موت نظر آتی ہے۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے کہ جس وقت بقائے حیات اہم ترین مقاصد کے پامال ہو جانے پر موقوف ہو اور عزت نفس اور فنائے وقتی کا سوال درپیش ہو تو ایسے میں اہل خرد موت کو زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور خود کو موت کی آغوش میں پہنچا کر حیات دائمی حاصل کر لیتے ہیں امام حسینؑ نے کربلا میں اپنے فریضہ کا احساس کرتے ہوئے جو راستہ طے کیا تھا وہ اسی اصول پر مبنی تھا۔ آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ''ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے۔'' صحرائے کربلا میں صدا بہ صحرا نہیں ہوئے بلکہ ان کا پائیدار مفہوم آج بھی غیرت دار اقوام کے زندگی کے منظر ناموں کا سرنامہ بنا ہوا ہے یہ مختصر الفاظ علو ہمت کا اعلان اور عزت نفس کے ترجمان ہیں۔

عام طور پر دیکھنے میں آیا ہے کہ جب انسان پر مصیبتیں پڑتی ہیں تو وہ بہت سی ایسی صورتیں اختیار کرتا ہے جو ایک خوددار انسان کے لئے قطعاً مناسب نہیں ہیں مگر امام حسینؑ نے کربلا کے میدان میں ابتدائے مصائب سے انتہائے مصائب تک کوئی ایسا طرز عمل نہیں اختیار کیا جو عزت نفس کے شایان شان نہ ہو۔ امام حسینؑ نے کربلا میں سوال آب کیا اور پیاس کا مختلف طریقے سے اظہار بھی کیا مگر تاریخ دم بخود ہے کہ حسینؑ یا انصار حسینؑ کسی نے بھی کسی موقع پر بھوک کی شکایت نہیں کی اور نہ غذا کا سوال کیا جب کہ یہ سب جہاں تین دن کے پیاسے تھے وہیں تین دن کے بھوکے بھی تھے اس کا سبب یہ ہے کہ پانی مانگنا خلاف

شرافت نہیں ہے عموماً لوگ ایک دوسرے سے پانی مانگ لیتے ہیں مگر بھوک کی تکلیف ظاہر کرنا فعل قبیح سمجھتے ہیں بلکہ پانی کا سوال بھی کوئی سوال نہ تھا سوال تو اس وقت کہا جا سکتا تھا کہ جب ان کے جمع کردہ ذخیرۂ آب سے پانی طلب کرتے یہاں تو اللہ تعالیٰ کی جاری کی ہوئی نہر پر بصورت ظلم وتشدد دشمنوں نے پہرہ بٹھا رکھا تھا دراصل جسے سوال کہا جا سکتا ہے وہ درحقیقت حق کا مطالبہ تھا اور ظلم ناروا کے خلاف احتجاج تھا اس کی نوعیت اس سوال کی نہیں ہے جو عزت نفس اور خودداری کے خلاف سمجھا جائے۔

شجاعت و بہادری:

ہم ہر اس انسان کو شجاع سمجھتے ہیں جو محل بے محل آمادہ پیکار رہے اور اپنی بہادری کا مظاہرہ کرتا رہے۔ دراصل اس کا نام شجاعت نہیں ہے بلکہ شجاعت کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت دامن فرض تار تار ہو رہا ہو اس وقت مناسب قدم اٹھائے اور چاہے اس میں اسے جان ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے اور جس موقع پر اقدام ضروری نہ ہو بلکہ سکوت اور چشم پوشی کی ضرورت ہو اس وقت صبر وتحمل سے کام لے، چاہے اس میں کتنے ہی مصائب وآلام در پیش آئیں اور ناگوار صورتوں کا مقابلہ کرنا پڑے اس صورت میں خاموشی اس طرح شجاعت کہلائے گی جس طرح پہلی شکل میں نبرد آزمائی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شجاعت کا صحیح مفہوم سانحہ کربلا سے مترشح ہوتا ہے۔

عزم واستقلال:

ناخوشگوار اور دشوار منزلوں پر انسان کے قدم نہ لڑکھڑائیں تو اسے ہم ثبات واستقلال کہتے ہیں۔ اس امتحان میں کربلا کا ہر مجاہد منفرد وممتاز نظر آتا ہے خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا حتیٰ کہ کمسن ہی کیوں نہ ہو۔ گفتار وکردار دو الگ الگ چیزیں ہیں کہنا آسان ہے مگر اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے اب تک جتنی جنگیں ہوئی ہیں ان میں بہت سی قوموں کی آزادیاں سلب ہوئی ہیں ہر قوم نے آغاز جنگ پر یہی کہا تھا کہ جب تک بدن میں لہو کا

آخری قطرہ باقی رہے گا دشمن کی غلامی قبول نہیں کریں گے مگر جہاں مشکلات سامنے آئیں اور دشواریوں کی تاب نہ لاسکے وہیں سپر انداختہ ہو گئے اس کے برعکس کربلا میں بچہ بچہ اپنے صرفی قول پر کھرا اترتا ہوا نظر آتا ہے کربلا میں جب امام حسینؑ نے انکار بیعت کیا تھا تو دنیا کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ اس ''انکار'' میں کتنے مشکلات کے مقابلہ کا عزم مضمر ہے۔
میدان کربلا میں ہزاروں مصائب وآلام کے سیلاب آئے اور اس کوہ عزم واستقلال یعنی امام حسینؑ سے ٹکرا کر واپس چلے گئے، عزم واستقلال کا جیسا مظاہرہ کربلا میں نظر آتا ہے ویسا کہیں اور نہیں ملتا۔

ایثار وقربانی:

ہم ضرورتوں کے اشتراک کے موقع پر دوسرے کو اپنے نفس پر مقدم کرنے کو ایثار سے تعبیر کرتے ہیں اس صفت کا بہترین نمونہ کربلا میں ملتا ہے۔امام حسینؑ نے ضرورت کے وقت دوست کے بجائے دشمن کو مقدم کر کے ایک لازوال مثال قائم کی اور آپ نے اپنا سارا پانی اس فوج حر کو پلا دیا جو سدراہ ہونے کے لئے آئی تھی، یا اصحاب واقارب کا امام حسینؑ کو اپنے جسم وجان پر مقدم قرار دینا اور اپنی ہستی کو جیتے جی معدوم سمجھنا یوں تو ہر شہید کا جذبۂ ایثار قابل توصیف تھا مگر سعید، زہیر، مسلم ابن عوسجہ، ہلال بن نافع نے ایثار کے ایسے مرقعے پیش کئے جنہیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔
امام حسینؑ نے قربانی بڑے منظم طریقہ سے پیش کی اگر وہ اپنی شہادت کے مرحلہ کو سب سے پہلے طے کر لیتے تو کہنے کو ہوتا کہ مصائب سے گھبرا کر اپنی جان دے دی لیکن آپ نے آہستہ آہستہ قربانی کے مراحل کو طے کیا تاکہ زمانے پر ظاہر ہو جائے کہ آپ کا اقدام کسی جذبہ کا وقتی نتیجہ نہیں ہے بلکہ معاملہ فہمی اور فرض شناسی کا بہترین نمونہ ہے امام حسینؑ نے اپنے اعزا واقارب کی لاشیں اٹھائیں اور آخر میں خود اپنی قربانی پیش کی حسین وانصار حسین کا جذبہ ایثار وقربانی ہمیں سچ اور سچائی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔

صبر اور تلقین صبر، حسن معاشرت اور مواسات، ہمدردی اور رواداری، حق گوئی اور حقانیت، اسلام کی تصدیق و اشاعت، روحانیت اور مذہب کی طاقت کا مظاہرہ وغیرہ ایسی اقدار ہیں جن کی معنویت ہر دور میں قائم رہے گی بلکہ جیسے جیسے وقت گذرتا جائے گا ویسے ویسے کربلا کے معنوی اقدار منکشف ہوتے جائیں گے۔

واقعۂ کربلا کی علامتی قوت

شاعری میں علامت کا استعمال عام طور پر اس وقت ہوتا ہے کہ جب شاعر کو شعر کے حقیقی معنی کے بجائے دوسرے جہات وابعاد کو بھی روشن کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر شاعر کو علامت سے احتراز ناگزیز ہوتا ہے۔ علامت شاعر کے مافی ضمیر کو ادا کرنے میں اس کی بھر پور معاونت کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ اچھے شعراء کی توجہ ہمیشہ نئی علامات، نئے استعارات کے مناسب استعمال پر رہی ہے لیکن اس سلسلہ میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ علامت کے استعمال میں معمولی سی لغزش بھی بہت بڑا ادبی نقص بن جاتی ہے۔ نئی اور خوبصورت علامتیں شاعری میں یقیناً قابل قدر اضافہ کرتی ہیں اور اشعار کی معنوی جہات کو بھی وسیع کرتی ہیں جس سے ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق مفہوم اخذ کرتا ہے۔ علامات واستعارات کے استعمال سے شعر میں معنوی وسعت کے ساتھ ساتھ ایک طرح کا حسن اور دلکشی بھی پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے ابتدا سے لے کر آج تک یہ اسلوب برقرار ہے اور موجودہ زمانے میں تو علامت کا دور دورہ ہے۔ علامتی طرز کی شاعری کی طرف معاصر شعراء کا غالب رجحان ہے۔ قدیم علامتوں میں نئے نئے مفاہیم کی جستجو کے ساتھ ساتھ نئی علامات کی تشکیل کی جارہی ہے۔

عرض کیا جاچکا ہے کہ علامات واشارات کا استعمال شاعری کے لئے ناگزیر ہے خصوصاً غزل کے لئے، دراصل غزل کی عظمت کا رمز، رمزیہ اسلوب ہی میں مضمر ہے کیونکہ غزل کا فن ایجاز واختصار کا طالب ہے اور ایجاز واختصار ہر ہر قدم پر علامات واشارات کے

استعمال کا طلب گار ہوتا ہے اور ہر اچھے اور بڑے شاعر کو نئی علامات اور نئے استعارات کی جستجو ہوتی ہے مگر نئی علامات و استعارات کا استعمال نہایت دشوار امر ہے اکثر شعراء ان کے استعمال میں احتمال کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کی ذرا سی بھول سے بہت بڑی ادبی خامی پیدا ہو جاتی ہے نئی علامتیں اور نئے استعارے یقیناً شعر و ادب میں قابل قدر اضافہ کا سبب بنتے ہیں ۔مگر ان کا تعلق تواریخ و روایات سے ہونا ضروری ہے جس قدر مستحکم و پائیدار روایت ہوگی اتنا ہی اس کے اطلاقات کا دائرہ وسیع اور کثیر المعنی ہوگا ایک مقام پر سجاد باقر رضوی نے لکھا ہے کہ:

> ''آج ہمارے ادب میں تجرید کی ایسی صورتیں ہیں کہ علامتوں کا تعلق روایت سے نہیں ہوتا جس کی وجہ سے عموماً علامتیں ذاتی اور شخصی ہو کر رہ جاتی ہیں جن کے مفاہیم فنکار کے بطن میں ہوتے ہیں۔''

مگر اب ہمارے شعراء نے علامات کے رمز کو جان لیا ہے کہ جن اشارات و کنایات اور استعارات کا ہماری شعری روایت سے گہرا تعلق ہے وہ علامات کربلا ہیں ان کے مفاہیم تسلیم شدہ ہیں اور انسان اپنی انفرادی سطح پر مخصوص کیفیات و حالات کے مطابق ان سے معنی و مطالب اخذ کر سکتا ہے۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ ہمارے اچھے اور بڑے شاعر نئی علامتوں کے تفحص و تشکیل کے عمل میں مصروف ہیں نئی علامتوں کی تشکیل میں سانحہ کربلا سے متعلق الفاظ اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔بعض شعراء نے سانحہ کربلا سے نہایت پر قوت علامتیں تشکیل دی ہیں ان میں عرفان صدیقی ،افتخار عارف ،انیس اشفاق ،منیر نیازی ،مجید امجد خاص طور پر قابل ذکر ہیں مثلاً نیزہ ،نوک نیزہ ،سر ،نوک سناں ،پیاس ،مشکیزہ ،تیر ،کمان ،تلوار ، ڈھال ،فرس ،صف ، دریا ،نہر ،فرات ،خیمہ ،طناب خیمہ ،خیمۂ تشنگان ،شامِ پُر ہول ،شام غریباں ،موج خوں ، لہو ،قاتل ،کوچۂ قاتل ،خنجر قاتل ،تیغ ،آب تیغ ،تیغ ستم ،زیر تیغ ستم ،تیغ براں ،تیغ جفا ،دشت بلا ،دیوار زنداں ،غریب الدیار ،حلق بریدہ ،ماتم خانۂ دل وغیرہ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہماری شاعری میں بہت پہلے سے موجود ہیں مگر عصر حاضر کی صورت حال سے بہت زیادہ ہم

آہنگ ہونے کی وجہ سے نئی شاعری میں انھوں نے علامتی حیثیت اختیار کر لی ہے جن شعراء کے یہاں واقعات کربلا پر مشتمل الفاظ نے علامتی شکل اختیار کر لی ہے ان میں عرفان صدیقی کا نام سب سے نمایاں ہے یہ رجحان ان کی شاعری کا کلیدی رجحان ہے۔ سب سے پہلے معاصر عہد میں نئی معنویت کے ساتھ اسے عرفان صدیقی ہی نے پیش کیا ہے۔ بقول شمس الرحمن فاروقی:

> ''یہ کہنا ضروری نہیں کہ بعض علامتیں اور پیکر جن کا تعلق اسلامی تاریخ، خاص کر معرکۂ کربلا سے ہے... جدید شاعری میں عرفان صدیقی کے یہاں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ استعاراتی قوت کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بات کہہ اس لئے رہا ہوں کہ یہ طرز اب اس قدر مقبول ہو گیا ہے کہ بہت سے لوگ اس کی 'ایجاد' کے دعوے دار ہو گئے ہیں۔''

(اردو چینل، شمس الرحمن فاروقی نمبر ص ۲۳۴، ج ۵، شمارہ ۔۴، دسمبر ۲۰۰۳، ممبئی)

عرفان صدیقی کے بعد جس شاعر نے علامات کربلا کا سب سے زیادہ اور بامعنی استعمال کیا ہے وہ افتخار عارف ہیں۔ افتخار عارف نے قدیم علامتوں کے باوصف نئی علامتوں کی شاندار تشکیل کی ہے یہ رجحان انیس اشفاق کے یہاں بھی ابتدائی دور میں بہت زیادہ تھا لیکن ادھر چند برسوں سے ان کے یہاں اس میں کمی آئی ہے اور اب وہ غالب کی طرح قدیم علامتوں میں نئے مفاہیم پیش کر رہے ہیں۔ منیر نیازی اور مجید امجد کے یہاں علامات کربلا یک نئی تخلیقی کیفیت اور تازگی کے ساتھ استعمال ہوئی ہیں مذکورہ شعراء کے اشعار سے سانحۂ کربلا کی علامتی قوت کا اندازہ بحسن و خوبی لگایا جا سکتا ہے لہٰذا چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

سنو کہ بول رہا ہے وہ سر اتارا ہوا
ہمارا مرنا بھی جینے کا استعارا ہوا

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر
یہ کیا پرندہ ہے شاخ شجر پہ وارا ہوا

ہر طرف اڑنے لگی گرد صدا زنجیر کی
کس قدر دیوار زنداں کو پریشانی ہوئی

بہ حد وسعت زنجیر گردش کرتا رہتا ہوں
کوئی وحشی گرفتار سفر ایسا نہیں ہوتا

سکوت خوف یہاں چار سو پکارتا ہے
نہ اسکی تیغ نہ میرا لہو پکارتا ہے

اب زباں خنجر قاتل کی ثنا کرتی ہے
ہم وہی کرتے ہیں جو خلق خدا کرتی ہے

خدا کرے صف سردادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

نہراس شہر کی بھی بہت مہربان ہے مگر اپنا رہوار مت روکنا
ہجرتوں کے مقدر میں باقی نہیں اب کوئی قریۂ معتبر، یا اخی

عرفان صدیقی

کہیں سے حرف معتبر شاید نہ آئے
مسافر لوٹ کر اب، اپنے گھر شاید نہ آئے

بلند ہاتھوں میں زنجیر ڈال دیتے ہیں
عجیب رسم چلی ہے دعا نہ مانگے کوئی

دمشق مصلحت و کوفۂ نفاق کے بیچ
فغانِ قافلۂ بے نوا کی قیمت کیا

قفس میں آب و دانے کی فراوانی بہت ہے
اسیروں کو خیال بال و پر شاید نہ آئے

بات تو جب ہے کہ اے گریۂ کن حرمتِ حرف
مدح قاتل میں مقالے بھی ترے شہر سے آئیں

خلق نے اک منظر نہیں دیکھا بہت دنوں سے
نوک سناں پہ سر نہیں دیکھا بہت دنوں سے

وہی پیاس ہے، وہی دشت ہے، وہی گھرانہ ہے
مشکیزے سے تیر کا رشتہ بہت پرانا ہے

خیمۂ عافیت کے طنابوں سے جکڑی ہوئی خلقت شہر
جاننا چاہتی ہے کہ منزل سے کیوں راستہ مختلف ہے

افتخار عارف

ہے زوال شام اک آئینہ رو منظر میں ہے
آسماں روشن ہے سارا اور لہو منظر میں ہے

کیا انوکھا زاویہ ہے ظلم کی تصویر کا
تیر منظر میں نہیں لیکن گلو منظر میں ہے

جب بھی گھر سے نکلوں سب کے ہاتھ میں خنجر دیکھوں
کب تک اپنی آنکھوں میں لہو کا منظر دیکھوں

کھڑے ہیں دونوں کسی فیصلے کے ہونے تک
میں سر بڑھائے ہوئے، تیغ وہ نکالے ہوئے

دیکھوں گا ابھی اور بھی خنجر کی روانی
قاتل کو ابھی اور بھی سفاک کروں گا

شہر کے اندر تھے جس میں بام و در ڈوبے ہوئے
شہر سے باہر وہ سیل خوں نظر آتا نہ تھا

تیرے چمن میں رات کو ہم نے ایک عجب آواز سنی ہے
اب کے شاید کوئی پرندہ خانۂ گل میں گریہ کناں ہے

انیس اشفاق

دل خوف میں ہے عالم فانی کو دیکھ کر
آتی ہے یاد موت کی پانی کو دیکھ کر

ہے باب شہر مردہ گزر گاہِ بادِ شام
میں چپ ہوں اس جگہ کی گرانی کو دیکھ کر

کر یاد ان دنوں کو کہ آباد تھیں یہاں
گلیاں جو خاک و خون کی دہشت سے بھر گئیں

زوال عصر ہے کوفے میں اور گداگر ہیں
کھلا نہیں کوئی در باب التجا کے سوا

بس ایک ماہ جنوں خیز کی ضیاء کے سوا
نگر میں کچھ نہیں باقی رہا ہوا کے سوا

سواد شہر پہ ہی رک گیا تھا میں تو منیرؔ
اور اک دشت بلا میرے گھر کی راہ میں ہے

منیرؔ نیازی

سلام ان پہ تہہ تیغ بھی جنھوں نے کہا
جو تیرا حکم ، جو تیری رضا ، جو تو چاہے

سلگتے جاتے ہیں چپ چاپ ہنستے جاتے ہیں
مثال چہرۂ پیغمبراں ، گلاب کے پھول

طلوع صبح کہاں ، ہم طلوع ہوتے گئے
ہمارا قافلۂ بے ردا روانہ ہوا

وہ شے جو ایک نئے دور کی بشارت ہے
ترے لہو کی تڑپتی ہوئی حرارت ہے

اک شوق بے اماں کے یہ نخچیر کون ہیں
اے موجۂ ہوا، تہہ زنجیر کون ہیں

شفق کے رنگ آنکھوں میں، سحر کی اوس پلکوں پر
نہ آئے پھر بھی لب پر چرخ نیلی فام کے شکوے

مجید امجد

درج بالا اشعار میں مستعمل سر، نیزہ، سرخ پھول، پرندہ، شاخ شجر، گرد صدا، دیوار زنداں، وسعت زنجیر، گرفتار سفر، سکوت خوف، تیغ، لہو، خنجر قاتل، صف سر دادگان، قریۂ معتبر، مسافر، زنجیر، دمشق مصلحت، کوفۂ نفاق، فغانِ قافلۂ بے نوا، قفس، گریہ کن حرمت حرف، نوک سناں، پیاس، دشت، مشکیزہ، تیر، خیمۂ عافیت، خلقت شہر، زوال شام، لہو، تیر، گلو، خنجر، سر، تیغ، سیل خوں، خانۂ گل، گریہ کناں، پانی، گزرگاہ بادشام، خاک وخوں، زوال عصر، باب التجا، سواد شہر، دشت بلا، تہہ تیغ، گلاب کے پھول، قافلۂ بے ردا، لہو، موجۂ ہوا، تہہ زنجیر، شفق کے رنگ، سحر کی اوس، چرخ نیلی فام وغیرہ کی علامتیں بیشتر اردو شاعری میں استعمال ہوئی ہیں ان اشعار کے سیاق وسباق سے بخوبی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ

مذکورہ علامتوں میں وہ عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں جو غزل میں معنویت اور وسعت پیدا کرتے ہیں۔

گذشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ عصری زندگی میں ظلم وستم، قتل وغارت گری کی یہ فراوانی انسانی زندگی کی اعلیٰ اقدار کی پامالی اور شر کی قوتوں کی بالادستی اور ایک حق پرست انسان کے مصائب اور جراحتوں کا ایک طویل سلسلہ کچھ ایسے پہلو ہیں جو ہمارے عہد کے شاعروں کے ذہن کو بار بار کربلا کے عظیم اور المناک واقعے کی طرف لے جاتے ہیں۔اب تک کے جائزے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سانحہ کربلا کثیر الجہات وکثیر الابعاد علامتوں کا منبع ہے اور اس کی علامتوں میں بے پناہ معنوی قوت مضمر ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعری میں علامات کربلا

کی
مخصوص اور معاصر معنویت

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ عرفانؔ صدیقی نے اپنی شاعری میں علامات کربلا کا مسلسل اور موثر استعمال کیا، انھوں نے ان علامتوں کے وسیع تر امکانات کی جستجو کی ہے اور ان میں معاصر معنویتیں پیدا کرنے کی پوری کوشش کی ہے ان کی شاعری کا مجموعی نظام کم وبیش ان ہی علامتوں سے تشکیل پاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ عرفانؔ صدیقی سے قبل کربلا کی لفظیات کا علامتی سطح پر استعمال نہ کیا گیا ہو لیکن بیشتر یہ استعمال اکہرا اور ایک سطحی نظر آتا ہے۔ عرفانؔ صدیقی کے معاصرین میں بھی بہت سے شاعروں نے ان علامتوں میں عصری مفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن عرفانؔ صدیقی کے یہاں پہلی بار ان علامتوں کے ذریعہ مختلف النوع تہہ دار اور کثیر الجہات معنی ومفاہیم کی ترجمانی کی گئی ہے۔ عرفانؔ صدیقی نے کربلا کے وقوعوں اور کرداروں کے پردے میں مفاہیم کی ایک نئی دنیا کی جستجو کی ہے۔ اب تک اس واقعہ سے متعلق لفظوں اور علامتوں میں اکہرے اور متعین مفاہیم بیان کئے جاتے تھے بالخصوص ترقی پسند شاعری میں یہ علامتیں انہی مفاہیم کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ بعد کے شعراء نے بھی عرفانؔ صدیقی کی طرح ان علامتوں کے وسیع تر امکانات کی طرف توجہ نہیں کی لیکن عرفانؔ صدیقی کی یہ علامتیں نئی اور معاصر معنویتوں کی ترجمانی کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوئیں اور پہلی بار انھوں نے ان

علامتوں کے دائرۂ عمل کو اپنے جولانی طبع کی بنا پر وسیع کر دیا اور ہم ان کے یہاں ان علامتوں کے پردے میں اپنے عہد کی صورت حال اور اس دور کے انسانی ضمیر کو روشن ہوتا ہوا دیکھ سکتے ہیں۔ عرفان صدیقی نے اپنے زمانے کے احوال و آثار کو ان علامتوں کے آئینہ میں پوری طرح منعکس کر دیا ہے ذیل میں ہم ان ہی علامتوں پر مشتمل اشعار ان کے پہلے مجموعہ ''کینوس'' سے نقل کر رہے ہیں اور ان میں سے بعض کے تجزیے کے ذریعہ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ عرفان صدیقی نے ان علامتوں میں کس طرح معاصر معنویتیں پیدا کی ہیں:

تیز رفتار ہیں دشمن کے فرس تجھ سے سوا
میرے بعد اے مری بکھری ہوئی صف تو بھی ہے

تم جو کچھ چاہو وہ تاریخ میں تحریر کرو
یہ تو نیزہ ہی سمجھتا ہے کہ سر میں کیا تھا

حریفِ تیغِ ستم گر تو کر دیا ہے تجھے
اب اور مجھ سے تو کیا چاہتا ہے سر میرے

سروں کے پھول سر نوک نیزہ ہنستے رہے
یہ فصل سوکھی ہوئی ٹہنیوں پہ پھلتی رہی

مری طرف تری موج نوا چلی ہی نہیں
ہوا کبھی سر دشت بلا چلی ہی نہیں

اک اور دن شہید ہوا ہو گئی ہے شام
لشکر سے شب کے شور اٹھا ہو گئی ہے شام

غربت کی دھول کیسے کسی کو دکھائی دے
میرے برہنہ سر کی ردا ہو گئی ہے شام

سورج کا خون بہنے لگا پھر ترائی میں
پھر دشت شب میں تیغِ جفا ہو گئی ہے شام

کہیں تو لٹنا ہے پھر نقد جاں بچانا کیا
اب آ گئے ہیں تو مقتل سے بچ کے جانا کیا؟

جو تیر بوڑھوں کی فریاد تک نہیں سنتے
تو ان کے سامنے بچوں کا مسکرانا کیا

میں گر گیا ہوں تو اب سینے سے اتر آؤ
دلیر دشمنو! ٹوٹے مکاں کو ڈھانا کیا

زرد دھرتی سے ہری گھاس کی کونپل پھوٹی
جیسے اک خیمہ سرِ دشت بلا لگتا ہے

اے لہو میں تجھے مقتل سے کہاں لے جاؤں
اپنے منظر ہی میں ہر رنگ بھلا لگتا ہے

موج خوں بن کر کناروں سے گزر جائیں گے لوگ
اتنی زنجیروں میں مت جکڑو بکھر جائیں گے لوگ

قاتلوں کے شہر میں بھی زندگی کرتے رہے
لوگ شاید یہ سمجھتے تھے کہ مر جائیں گے لوگ

ان گنت منظر ہیں اور دل میں لہو دو چار بوند
رنگ آخر کتنی تصویروں میں بھر جائیں گے لوگ

مندرجہ بالا اشعار میں مستعمل فرس، صف، نیزہ، سر، تیغ ستم، سروں کے پھول، سرنوک نیزہ، موج نوا، دشب بلا، برہنہ سر، ردا، شام، سورج، خون، ترائی، تیغ جفا، لہو، مقتل،

موج خوں، زنجیر، قاتل وغیرہ علامتوں کو عرفانؔ صدیقی نے اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان میں نئے نئے مفاہیم کے ساتھ کثرت معنی کی صفت بھی پیدا ہو گئی ہے عرض کیا جا چکا ہے کہ نئی شاعری میں جن شعراء نے علامتی سطح پر سب سے زیادہ اچھی طرح سانحہ کربلا اور اس کے تعلیقات کو برتا ہے ان میں سب سے اہم نام عرفانؔ صدیقی کا ہے ہمارے اس دعوے کی تائید ذیل میں دئے گئے اشعار کے تجزیاتی مطالعہ سے بحسن وخوبی ہو جائے گی :

حریف تیغ ستم گر تو کر دیا ہے تجھے
اب اور مجھ سے تو کیا چاہتا ہے سر میرے

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میں نے نا مساعد حالات میں اپنے سر کو ستم کی تیغ سے ٹکرانے کے قابل بنا دیا ہے اور اس پر آشوب دور میں یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس شعر میں تیغ ستم ظالم اور سر مظلوم کی علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں اب اس شعر کا مطلب یہ ہوا کہ ظلم واستبداد کے اس ماحول میں جب لوگ حق بیانی تو درکنار سچائی سے سامنا کرنے میں بھی جھجک محسوس کر رہے ہیں ایسے میں ظلم وتشدد سے نبرد آزمائی نہایت دشوار امر ہے اگر کوئی شخص ان حالات میں ظلم کے خلاف صف آرا ہو جائے تو یقیناً قابل ستائش ہے موجودہ پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ آج بھی لوگ ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں اور مصلحت وقت کا شکار ہیں ایسے حالات میں بھی شاعر ظلم وستم کے خلاف آواز بلند کر رہا ہے۔ سر کا حریف تیغ ستم گر ہونا ظلم کے خلاف صف آرا ہونا ہے۔ ہماری زندگی کا اہم ترین مقصد ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا ہے سو یہ مقصد ہم نے پورا کر دیا۔ حق وباطل کی صف آرائی ہمارے معاشرے میں آج پوری طرح موجود ہے لیکن باطل کے خلاف معرکہ آرائی کرنے والے بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ اس معرکہ آرائی میں اپنی جان کے زیاں کی پروا نہیں کرتے:

مری طرف تری موج نوا چلی ہی نہیں
ہوا کبھی سر دشت بلا چلی ہی نہیں

اس شعر کے معنی تقریباً وہی ہیں جو پہلے شعر کے ہیں وہی بات اس شعر میں

دوسرے انداز میں کہی گئی ہے اس کا مطلب بہت واضح ہے کہ مظلوم کربلا امام حسینؓ ہم تک تیرا استغاثہ نصرت نہیں آیا یعنی ہم کربلا کے میدان میں موجود نہیں تھے اگر ہم وہاں ہوتے تو آپ کی نصرت ضرور کرتے اور خود کو راہ حق میں قربان کر دیتے اس شعر سے بھی پہلے والے شعر کی طرح جذبۂ نصرت حق کا اظہار ہوتا ہے اور یہ شعر یوں بھی عام انسانی زندگی کے لئے حوصلہ افزا ہے کہ جب کسی ستم رسیدہ مظلوم پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھو تو ظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر کے اس کے ظلم وستم کا سد باب کرو۔ عرفان صدیقی خاموشی سے ظلم سہتے رہنے کو فعل قبیح سمجھتے ہیں وہ اپنی شاعری سے مظلوم افراد کو بار بار مہمیز کرتے رہتے ہیں اور انہیں ظلم کے خلاف آواز حق بلند کرنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں ان کا بہت مشہور شعر ہے :

بہت کچھ دوستو! بسمل کے چپ رہنے سے ہوتا ہے
فقط اس خنجر دست جفا سے کچھ نہیں ہوتا

ابھی ہم نے ایک شعر کے مفہوم کی تشریح میں یہ بات کہی ہے کہ لوگ ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے خوف محسوس کرتے ہیں اس شعر میں عرفان صدیقی نے اسی طرف اشارہ کیا ہے بسمل کا چپ رہنا ہی اس کی موت کا سبب ہے اگر وہ تیغ جفا کے سامنے سینہ سپر ہو تو ظلم کو مدافعت کا احساس ہو اور اسے بھی تیغ اٹھاتے ہوئے خوف محسوس ہو لیکن بسمل کی خاموشی نہ صرف ظلم کو سر اٹھانے کا موقع فراہم کر رہی ہے بلکہ اس کی تائید بھی کر رہی ہے ہم جس معاشرہ میں سانس لے رہے ہیں وہاں ظلم کا بول بالا ہے لیکن ہم میں ظلم کے خلاف محاذ کھولنے کی جرأت نہیں، اسی لئے ظلم کو پنپنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس شعر میں یہ مفہوم بھی پنہاں ہے کہ جتنا بڑا ظلم، ظلم کرنا ہے اتنا ہی بڑا ظلم، ظلم ہوتے ہوئے دیکھنا اور ظلم کے سامنے خاموش رہنا ہے یہ شعر اگر چہ عرفان صدیقی نے بہت پہلے کہا ہے لیکن اگر اسے گجرات کے المیہ کے پس منظر میں دیکھا جائے تو ہمیں آج بھی اس میں عصری معنویت نظر آتی ہے جس طرح گجرات میں ہونے والے مظالم کے خلاف آواز بلند کی گئی اور جس طرح ظالم کے چہرے کو بے نقاب کیا گیا وہ اسی جرأت اظہار اور قوت پیکار کا نتیجہ ہے:

ایک اور دن شہید ہوا ہو گئی ہے شام
لشکر سے شب کے شور اٹھا ہو گئی ہے شام

سانحۂ کربلا کے جزئیات میں سکینہ بنت الحسین کی شہادت بھی ایک اہم جز ہے۔ امام حسینؑ کی اس چار برس کی بیٹی نے کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک جس عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے وہ حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے شاعر نے سکینہ کو عزم و استقلال کے استعارہ کے طور پر نظم کیا ہے اس کمسن بچی نے مصائب و آلام کے ہجوم و ہموم میں رنج مسافرت سے بے نیاز ہو کر مقصد شہادت کی تشہیر اور اعلائے کلمۃ الحق میں زبردست کردار ادا کیا یہ بچی زندان شام کے پر ہول اندھیرے میں گھٹ گھٹ کر مرجاتی ہے۔ عرفان صدیقی نے اس شعر میں سکینہ بنت الحسین کی شہادت کی طرف اشارہ کیا ہے اس شعر میں دن روشن کردار ''سکینہ'' کی اور شام تاریک قید خانہ ''ظلم'' کی علامت کے طور پر آیا ہے یعنی سکینہ کی شہادت سے ہر طرف تاریکی چھا گئی ہے اور اس شہادت سے لشکر شب (یزیدی فوج) میں بھی رنج و غم کی لہر دوڑ گئی ہے کہ ایک اور معصوم قیدی یزیدی ظلم کی نذر ہو گیا:

سورج کا خون بہنے لگا پھر ترائی میں
پھر دشت شب میں تیغ جفا ہو گئی ہے شام

اس شعر کا مفہوم بھی وہی ہے جو اس سے پہلے والے شعر کا ہے مگر اس شعر میں صرف ایک لفظ ''ترائی'' نے ساری کیفیت کو بدل دیا ہے سورج سے یہاں امام حسین کے بھائی اور حسینی لشکر کے علمدار ابوالفضل العباس مراد ہیں جن کی شہادت نہر فرات کے کنارے ہوئی اور شہادت سے قبل تیغ جفا سے ان کے بازوؤں کو کاٹا گیا ان کی شہادت کے بعد اہل حرم کو شام غریباں کی روح فرسا اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حق کے طرفداروں کا لہو ہمیشہ بہایا جاتا رہا ہے اور اہل حق کو ابتدا ہی سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے ان اشعار میں عرفان صدیقی نے لفظوں کے حسن استعمال کا بہترین مظاہرہ کیا ہے دن (سورج) لشکر شب (دشت شب) صرف دو لفظوں کی تبدیلی نے مفہوم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے اگر عصری معنویت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو سورج بیک وقت کئی مفاہیم کی ترجمانی کر رہا ہے سورج یہاں ہمارے تہذیبی تشخص کی علامت بھی ہے اور ہمارے تمدنی آثار کی علامت بھی ہے اور خود ہمارے وجود کی علامت

بھی، بابری مسجد کے انہدام سے لے کر گجرات کے حالیہ فسادات تک ہمارے اس تشخص اور آثار و علائم کو فنا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور فنا کا یہ عمل یعنی تاریکی سے عبارت ہے ہماری تہذیبی علامتوں اور ہمارے تشخص کی شناخت ہماری روشنی ہے اور سورج کا خون بہنا یعنی روشنی کا ختم کر دیا جانا ہے:

زرد دھرتی سے ہری گھاس کی کونپل پھوٹی
جیسے اک خیمہ سر دشت بلا لگتا ہے

یہ صرف ایک شعر نہیں بلکہ مکمل تہذیبی منظر نامہ ہے جسے عرفان صدیقی نے لفظوں کا پیرہن پہنا کر ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ زرد دھرتی بنجر زمین کی علامت ہے اور بنجر زمین پر ہری گھاس کا اگنا ناممکن ہے لیکن ناممکن ہی سے ممکن کا وجود صادر ہوتا ہے اب مطلب یہ ہوا کہ دشت بلا میں ایک خیمہ 'اہل حق' نے پورے صحرا کو آباد کر دیا۔ دوسرا مفہوم اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ اگر صاحبان عزم و حوصلہ چند افراد ہی ہوں تو وہ ظلم و جور کو نیست و نابود کر سکتے ہیں لیکن اس شعر کے معنی پنہاں کی طرف آسانی سے ذہن منتقل نہیں ہوتا یہاں زرد دھرتی کربلا کی وہ زمین ہے جس پر ابھی حسینی قافلہ وارد نہیں ہوا ہے ہری کونپل پھوٹنے سے مراد ایک نئے زمانہ کا طلوع ہونا ہے۔ سر دشت بلا خیمے کے لگنے سے مراد حسینی قافلے کی آمد۔ اب شعر کا مفہوم یہ ہوا کہ حسینی قافلہ کے ورود سے قبل کربلا کی زمین شرف حق سے باریاب نہیں ہوئی تھی جو معرکہ اس سرزمین پر برپا ہوا اس نے زرد دھرتی یعنی ظلم کے بطن سے صبح حق یعنی (ہری کونپل) کو برآمد کیا اگر یہ معرکہ نہ ہوا ہوتا تو وہ زمین ہمیشہ زرد رہتی ہے اسے سرسبزی اس معرکہ حق نے عطا کی جس نے انکار بیعت کے ذریعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ظلم کا خاتمہ کر دیا:

قاتلوں کے شہر میں بھی زندگی کرتے رہے
لوگ شاید یہ سمجھتے تھے کہ مر جائیں گے لوگ

اس شعر کا بالواسطہ تعلق اہل حرم سے ہے جنہیں امام حسین کی شہادت کے بعد کوفہ و شام کے بازاروں میں ریسمان ظلم میں جکڑ کر کشاں کشاں پھرایا گیا اور پھر دمشق

کے قید خانہ میں قید کر دیا گیا یزید نے اہلبیتؑ کو اس لئے قید کیا تھا کہ یہ لوگ شہدائے کربلا کے غم میں گھٹ گھٹ کر زنداں میں دم توڑ دیں گے اور قصہ تمام ہو جائے گا مگر اس کے علی الرغم ان قیدیوں نے یزید اور اس کے سپاہیوں کی نیندیں اڑا دیں اور ان کی زندگی موت کے مماثل بن گئی اور شہداء کی موت حیات جاودانی میں تبدیل ہوگئی ان قیدیوں نے اپنے خطبات سے تشہیر شہادت کر کے امام حسینؑ کے مقصد قربانی کو اس طرح مترشح کیا کہ شکست وفتح کا معیار ہی بدل کر رکھ دیا اب تک سر کاٹنے والا فاتح اور سر کٹانے والا مفتوح، گھر لوٹنے والا غالب اور گھر لٹانے والا مغلوب کہلاتا تھا مگر شہادت حسینؑ کے بعد امام حسینؑ قتل ہونے کے باوجود فاتح کہلائے اور یزید قتل کرنے کے بعد بھی مفتوح قرار پایا:

ان گنت منظر ہیں اور دل میں لہو دو چار بوند
رنگ آخر کتنی تصویروں میں بھر جائیں گے لوگ

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جن منظروں میں رنگ بھرنا ہے وہ بہت زیادہ ہیں اور دل میں لہو دو چار بوند ہے ایسی حالت میں وہ لوگ جو مصور حیات ہیں اپنے لہو سے کتنی تصویروں کو رنگین بنا سکتے ہیں اس شعر کا لہجہ عاجزانہ ہے لہٰذا اس میں ''ان گنت منظر'' ظلم کی اور ''دل'' دنیا کی ''لہو کی دو چار بوند'' انصاف پسند افراد کی علامت ہے اس طرح اس کا مطلب یہ ہوا کہ چند اہل خیر اس اتنی بڑی کائنات کو کس طرح سے ظلم وستم سے پاک کر سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا اشعار کے تجزیئے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی نے علامات کربلا کی معنوی قوت کو ابتدا ہی میں سمجھ لیا تھا۔ ''کینوس'' میں علامات کربلا کے حوالہ سے عرفان صدیقی ایک اہم اور نمائندہ شاعر کی حیثیت سے ابھرتے ہیں مگر ان کے دوسرے مجموعے ''شب درمیاں'' میں واقعات کربلا اور اس کے جزئیات زیادہ بہتر طریقے سے بیان کئے گئے ہیں اور یہ ''کینوس'' کے مقابلہ زیادہ تہہ دار مفاہیم کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بطور نمونہ ''شب درمیاں'' سے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دلوں سے درد کا احساس گھٹتا جاتا ہے
یہ کشتگاں کا قبیلہ سمٹتا جاتا ہے

دیکھیے کس صبح نصرت کی خبر سنتا ہوں میں
لشکروں کی آہٹیں تو رات بھر سنتا ہوں میں

کوئی نیزہ سرفرازی دے تو کچھ آئے یقیں
خشک ٹہنی پر بھی آتے ہیں ثمر سنتا ہوں میں

یہ کس نے دست بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخلِ دعا نکل آئے

خدا کرے صفِ سرداد گاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

کہ جیسے میں سرِ دریا گھرا ہوں نیزوں میں
کہ جیسے خیمۂ صحرا سے تو پکارتا ہے

دولتِ سر ہوں سو ہر جیتنے والا لشکر
طشت میں رکھتا ہے نیزے پہ سجاتا ہے مجھے

سنو کہ بول رہا ہے وہ سر اتارا ہوا
ہمارا مرنا بھی جینے کا استعارا ہوا

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر
یہ کیا پرندہ ہے شاخِ شجر پہ وارا ہوا

تری تیغ تو مری فتح مندی کا اعلان ہے
یہ بازو نہ کٹتے اگر میرا مشکیزہ بھرتا نہیں

نہر کے نام جاگیر خوں دوستو
دولتِ جاں کڑکتی کمانوں کے نام

تشنگی مرے سوکھے گلے کا نصیب
دودھ کی چھاگلیں میہمانوں کے نام

ہم اپنے ذہن کی آب وہوا میں زندہ ہیں
عجب درخت ہیں دشت بلا میں زندہ ہیں

ہوائے کوفۂ نامہرباں کو حیرت ہے
یہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں

ہم تہی دستوں کے ہاتھوں میں نہ چادر ہے نہ خاک
بی بیو ! تم نے کس امید پہ سر کھولا ہے

میرے بازوئے بریدہ کا کنایہ بھی سمجھ
دیکھ تجھ کو مری بیعت نہیں ملنے والی

مندرجہ بالا اشعار میں مستعمل کشتگاں کا قبیلہ، صبح نصرت، نیزہ، سر، خشک ٹہنی، ثمر، دست بریدہ، نخل دعا، صف سردادگاں، سر دریا، خیمۂ صحرا، دولت سر، طشت، سرخ پھول، پرندہ، شاخ شجر، بازو، نہر، جاگیرِ خوں، دولت جاں، کڑکتی کمان، تشنگی، سوکھے گلے، دشت بلا، کوفۂ نامہرباں، خیمۂ صبر و رضا، چادر، سر، بازوئے بریدہ، بیعت وغیرہ کی علامتیں اپنی بھر پور معنوی قوت کے ساتھ آئی ہیں۔ ان اشعار کی معنوی قوت کو ظاہر کرنے کے لئے کچھ اشعار کا تجزیہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:

دیکھئے کس صبح نصرت کی خبر سنتا ہوں میں
لشکروں کی آہٹیں تو رات بھر سنتا ہوں میں

اس شعر کا پہلا مفہوم یہ ہے کہ اصحاب حسین کربلا میں دیکھ رہے تھے یزیدی فوج کے دستے مسلسل کربلا میں آرہے تھے مگر اصحاب حسین کو نصرت کی اجازت نہیں مل رہی تھی وہ نصرت حق میں شہید ہونے کے لئے مضطرب تھے اور شہادت سے سرخ رو ہو کر اپنی فتح وظفر

کا اعلان کرنا چاہتے تھے ان کا شوق شہادت اور جذبۂ نصرت حق اس منزل پر تھا کہ انہیں اپنے سر اپنے کاندھوں پر بوجھ لگنے لگے تھے۔ اس شعر میں قیام امن اور خاتمۂ شر کا پیغام مضمر ہے۔

اس شعر کے دوسرے معنی بزبان ممدوح حر سے متعلق ہیں۔ حر واقعہ کربلا کا نہایت پرقوت کردار ہے اس نے امام حسینؑ کے لجام فرس پر ہاتھ ڈالا تھا اور ان کا راستہ روک کر انہیں کربلا گھیر کر لایا تھا یہی حر شب عاشور فرزند رسول کے قتل کی تیاریاں دیکھ کر لرز اٹھتا ہے اور ابن زیاد سے دریافت کرتا ہے کہ کیا یہ جنگ کسی صورت سے ٹل نہیں سکتی؟ ابن زیاد حر سے کہتا ہے حر تجھ جیسا بہادر سردار تین دن کے بھوکے پیاسے چند افراد سے جنگ کے تصور سے ڈر رہا ہے، حر نے اسے بتایا کہ وہ جنگ کے تصور سے نہیں بلکہ معرکہ خیر وشر میں لشکر اشرار کے ساتھ ہونے پر نادم ہے اور لشکر اخیار کو یہاں گھیر کر لانے والا بھی وہی ہے اسی نے اہل خیر کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا ہے لہٰذا اس سلسلہ کا سب سے بڑا مجرم وہ خود ہے۔ حر کا ضمیر حر کو مسلسل کچو کے دیتا رہتا ہے بالآخر صبح عاشور حر یزیدی لشکر کو چھوڑ کر حسینی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے اور اپنی جان امام حسینؑ پر قربان کر دیتا ہے لہٰذا حر بیداریٔ ضمیر کی علامت ہے، اب شعر کا مطلب یہ ہوا کہ معرکۂ حق و باطل میں ہمیشہ حق کی نصرت کرنا چاہئے خواہ اس میں جان ہی کیوں نہ چلی جائے:

کوئی نیزہ سرفرازی دے تو کچھ آئے یقیں
خشک ٹہنی پر بھی آتے ہیں ثمر سنتا ہوں میں

اس شعر میں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو اس سے قبل والے شعر میں کہی گئی ہے جو بات عرفانؔ صدیقی پہلے والے شعر میں کہنا چاہتے تھے وہی بات اس شعر میں بہت اچھے انداز میں کہی ہے اس شعر میں بھی جذبۂ شہادت کو ظاہر کیا گیا ہے یعنی جو لشکر یزید کا سپہ سالار تھا اس کے بارے میں گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ حر (خشک ٹہنی) بھی شہادت (ثمر) سے سرخ رو ہوگا لیکن جب حر نے جام شہادت نوش فرمایا تو یقین ہوگیا کہ کبھی کبھی خشک ٹہنی پر بھی ثمر آتے ہیں:

یہ کس نے دست بریدہ کی فصل بوئی تھی
تمام شہر میں نخلِ دعا نکل آئے

اس شعر میں کربلا کے اس وقوعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس میں امام حسینؑ کے بھائی ابوالفضل العباس نے نہر کے کنارے اپنے بازوؤں کو قلم کرا کے وفاداری کا ایسا عدیم المثال نمونہ پیش کیا کہ دنیا انگشت بدنداں ہے۔ اس شعر کا پہلا مصرعہ ظلم کے نتیجہ کو اور دوسرا استغاثہ کے ردعمل کو ظاہر کرتا ہے اس شعر میں عرفانؔ صدیقی کا فن منتہائے کمال پر نظر آتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں انہوں نے ظلم کا کوئی واضح اشارہ نہیں کیا ہے اور نہ دوسرے مصرعہ میں اس کے ردعمل کو ظاہر کیا ہے لیکن 'دست بریدہ کی فصل' بونے کے نتیجے نے 'نخلِ دعا' کے نکلنے سے دست بریدہ اور نخلِ دعا کے رشتے کو خود بخود نمایاں کر دیا ہے مطلب یہ ہوا کہ ظالم نے مظلوم کے ہاتھوں کو اس لئے کاٹا تھا کہ پرچم حق سرنگوں ہو جائے مگر اس کے برعکس ہوا۔ ایک کے ہاتھ کاٹے گئے تو سینکڑوں ہاتھ پرچم حق کو بلند کرنے کے لئے پیدا ہو گئے۔ اعلائے کلمۃ الحق کی یہ خواہش عرفانؔ صدیقی کے یہاں جگہ جگہ نظر آتی ہے ''شب درمیاں'' ہی کے ایک شعر میں اس شعر کی توسیع کی گئی ہے:

خدا کرے صفِ سردادگاں نہ ہو خالی
جو میں گروں تو کوئی دوسرا نکل آئے

●

یہ سرخ پھول سا کیا کھل رہا ہے نیزے پر
یہ کیا پرندہ ہے شاخِ شجر پہ وارا ہوا

اس شعر میں عرفانؔ صدیقی نے پھول اور نیزے کو سرخ رنگ کے حوالے سے مربوط استعارے میں تبدیل کر دیا ہے اس مقام پر نیزہ شاخِ شجر کے مترادف کے طور پر آیا ہے اور پرندہ کی صورت میں اڑان، عظمت، بلندی اور ماورائیت کی صفات کی وجہ سے یہ امام حسینؑ کی شہادت کی استعاراتی تلمیح بن گیا ہے۔ اس شعر سے جو مفہوم برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ امام حسینؑ نے دین حق کی بقا کی خاطر اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ دشمن نے ان کی شہادت

کے بعد ان کے سر کو نیزہ پر بلند کیا، دشمن کا ان کے سر کو نیزہ پر بلند کرنا اس کی شکست کا اعلان ہے کہ امام حسین کا سفر قتل ہونے کے باوجود جاری ہے اور وہ نیزے کی بلندی پر ہیں نیزہ پر کھلنے اور چمکنے سے مراد اس موقع پر اعلان فتح اور دشمن کا تمسخر اڑانا ہے :

تری تیغ تو مری فتح مندی کا اعلان ہے
یہ بازو نہ کٹتے اگر میرا مشکیزہ بھرتا نہیں

اس شعر میں شاعر نے حضرت عباس کے نہر فرات سے مشکیزہ کو پانی سے بھرنے اور ان کے بازو قلم کئے جانے کے وقوعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، عباس چاہتے تھے کہ کسی طرح خیام حسینی میں پانی پہنچ جائے اور فوج یزید چاہتی تھی کہ پانی خیموں میں نہ جانے پائے مگر عباس نہر فرات میں داخل ہو کر خشک مشکیزے کو پانی سے بھر لیتے ہیں اس طرح عباس کی ایک آرزو تو پوری ہوگی مگر دوسری تمنا خیموں تک پانی پہنچانے کی پوری نہیں ہو سکی کیونکہ فوج یزید نے عباس کے بازو قلم کر دئے اور مشک پر تیر مار کر پانی کو بہا دیا لیکن عباس کے بازوؤں کا قلم ہونا ان کی فتح (نہر پر قبضہ کرنے) کا اعلان تھا اس سے صاف ظاہر ہے کہ ستم کا عباس کے ہاتھ قلم کرنا اس کی شکست کا اعتراف ہے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ انسان کو ہر اچھے کام کی تکمیل کے لئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہٰذا اسے کسی کام کے آغاز سے قبل اس راہ میں درپیش صعوبتوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے تیسرے یہ کہ 'مشکیزہ' خواہشات کے سرچشمے اور 'پانی' تکمیل خواہشات کی علامت ہے:

ہوائے کوفۂ نا مہرباں کو حیرت ہے
یہ لوگ خیمۂ صبر و رضا میں زندہ ہیں ؟

اہل کوفہ نے امام حسینؑ کو سینکڑوں خطوط لکھ کر اپنی ہدایت کی خواہش ظاہر کی اور انہیں کوفہ آنے کی دعوت دی، امام حسینؑ نے اپنے چچازاد بھائی مسلم ابن عقیل کو اپنا سفیر بنا کر کوفہ کے لئے روانہ کر دیا تا کہ صحیح صورت حال ظاہر ہو سکے کوفیوں نے مسلم ابن عقیل کو اپنے شہر میں مہمان بلا کر ان سے بے وفائی کی اور انہیں قتل کر کے ان کی لاش کو کوفہ کی گلیوں میں کشاں کشاں پھرایا تبھی سے کوفہ بے وفائی اور دغا بازی کی علامت کے طور پر استعمال

ہونے لگا۔عرفان صدیقی نے اس شعر میں اسی وقوعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بے وفا کوفیوں کواس بات پر حیرت ہے کہ ان کی بے وفائی اور دغابازی کے باوجود ظلم وستم کا نشانہ بننے والے صاحبان صبرورضا کس طرح زندہ رہ گئے:

ہم تہی دستوں کے ہاتھوں میں نہ چادر ہے نہ خاک
بی بیو ! تم نے کس امید پہ سر کھولا ہے

اس شعر کا پہلا مفہوم تو یہ ہے کہ اے بی بیو! ہم اس قدر مجبور ولاچار ہیں کہ نہ تو ہمارے اختیار میں چادر ہے اور نہ ہمارے ہاتھ میں خاک ہے کہ تمہاری پردہ پوشی کرسکیں پھر تم کس امید پر ہمارا انتظار کر رہی ہو کہ ہمارے مرد آئیں گے اور ہمیں چادر اڑھائیں گے۔ پہلے مصرع میں بے بسی اور بے کسی کی جو تصویر پیش کی گئی ہے وہ انتہائے مظلومیت کو ظاہر کررہی ہے کہ ہم تمہارے چہروں پر مٹھی بھر خاک بھی نہیں ڈال سکتے جس سے تمہارے چہرے نہ پہچانے جاسکیں اس شعر میں چادر اور خاک کے حوالے سے جن بی بیوں کی بے پردگی کی منظر کشی کی گئی ہے ان کا تعلق کربلا سے نہیں ہے بلکہ عصر حاضر سے ہے۔عرفان صدیقی نے اس شعر میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کی مرقعہ نگاری کی ہے اس شعر کی گجرات کے حالیہ فسادات پر زبردست تطبیق ہوتی ہے یہاں اگر کربلا کا وقوعہ مراد لیں گے تو شعر خلاف وقوعہ چلا جائے گا کیونکہ وہاں سر کھولنا اختیاری فعل نہیں تھا بلکہ بالجبر ردائیں چھین لی گئیں تھیں دوسرے یہ کہ تہی دست کی ترکیب سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں علامات کربلا کا سہارا لے کر شاعر نے موجودہ عہد کی عکاسی کی ہے ورنہ ایسے موقعوں پر عرفان صدیقی 'تہی دست' کی نہیں بلکہ 'دست بریدہ' کی ترکیب استعمال کرتے ہیں لہٰذا تفہیم عرفان کے وقت اس کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ وہ کربلا کے الفاظ وعلامات کے توسط سے معاصر عہد کی صورت حال کو ظاہر کرتے ہیں۔

عرفان صدیقی کے مندرجہ بالا اشعار کے تجزیاتی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کربلا کے المیہ کو ہمارے عہد کے مسائل سے اس طرح جوڑ دیا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سانحہ کربلا ہمارے روزمرہ پیش آنے والے مسائل ومراحل سے زبردست

مطابقت رکھتا ہے اور ہمارا عہد اس سے مختلف نہیں بلکہ جو ظلم واستبداد کربلا میں ہوا وہی جور وستم آج بھی ہم پر کسی نہ کسی شکل میں ہوتا رہتا ہے۔

''کینوس'' اور ''شب درمیاں'' کے اشعار میں مستعمل علامات کربلا کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عرفان صدیقی کے یہاں یہ رجحان مسلسل ارتقاء کی منازل طے کرتا نظر آتا ہے جب کہ ان کے معاصرین کے یہاں جمود طاری ہو چکا ہے ''سات سماوات'' میں یہ رجحان منزل کمال پر پہنچ گیا ہے۔ ''سات سماوات'' سے بھی چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

اب جو چمکا ہے یہ خنجر تو خیال آتا ہے
تجھ کو دیکھا ہو کبھی نہر کنارے جیسے

آج تک اہل ستم ہی سے شکایت تھی مجھے
اب مرے باب میں ہیں اہل وفا بھی خاموش

خیمۂ شب میں عجب حشر عزا برپا ہے
اور ابھی رات چراغوں نے اجالی بھی نہیں

سروں کو ربط رہا ہے سناں سے پہلے بھی
گزر چکے ہیں یہ لشکر یہاں سے پہلے بھی

ہماری خاک پہ صحرا تھا مہربان بہت
ہوائے کوفۂ نا مہرباں سے پہلے بھی

وہ شعلہ اپنی ہی تیزی میں جل بجھا ورنہ
رکھا تھا خیمۂ صبر ورضا نشانے پر

نوک سناں نے بیعت جاں کا کیا سوال
سر نے کہا قبول ، نظر نے کہا نہیں

قید خانے سے نکل آئے تو صحرا کا حصار
ہم سے ٹوٹے گی یہ زنجیر گرفتاری کیا ؟

اس نے پوچھا تھا کہ سر بیچنے والا ہے کوئی
ہم نے سرنامۂ جاں نذر گزارا ہے کہ ہم

وہ مرحلہ ہے کہ اب سیل خوں پہ راضی ہیں
ہم اس زمین کو شاداب دیکھنے کے لئے

طے ہو چکے سب آبلہ پائی کے مرحلے
اب یہ زمیں گلابوں سے ڈھک جانا چاہئے

منظر وہی ، پیکر وہی ، دیکھیں کوئی پیاسا بھی ہے
لشکر بھی ہے، خنجر بھی ہے، پہرا بھی ہے، دریا بھی ہے

پیاس نے آب رواں کو کر دیا موج سراب
یہ تماشا دیکھ کر دریا کو حیرانی ہوئی

ایک طریقہ یہ بھی ہے جب جینا اک ناچاری ہو
ہاتھ بندھے ہوں سینے پر ، دل بیعت سے انکاری ہو

نمو کرنے کو ہے میرا لہو قاتل کے سینے سے
وہ چشمہ ہوں کہ پتھر سے ابلنا چاہتا ہوں میں

روشنی میں لوگ اعلان وفاداری کریں
شمع گل ہوتے ہی سب چلنے کی تیاری کریں

مندرجہ بالا اشعار میں نہر، اہل ستم، اہل وفا، خیمۂ شب، سناں، لشکر، خاک، کوفۂ نامہرباں، خیمۂ صبر ورضا، نوک سناں، بیعت جاں، زنجیر گرفتاری، سرنامۂ جاں، سیل خوں،

آبلہ پائی، خنجر، دریا، بیعت،لہو پتھر، روشنی، شمع وغیرہ کی علامتوں کے وسیلہ سے عصری مسائل کو عرفان صدیقی نے بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ عصری حسیت کا مسئلہ عرفان صدیقی کے یہاں دوسرے شعراء سے ذرا مختلف ہے ان کے اشعار میں عصری حسیت اس طرح نہیں ملتی کہ ان کے زمانے میں کوئی واقعہ پیش آیا اور اس نے انہیں متاثر کیا اور انہوں نے وقتی تاثر کے تحت اسے نظم کر دیا جب تک واقعہ کا تاثر قائم رہا تب تک شعر بھی با معنی رہا اور جیسے ہی واقعہ کا تاثر ختم ہوا ویسے ہی شعر بھی بے معنی ہو گیا۔ عرفان صدیقی کے یہاں عصری حسیت اس طرح سے آئی ہے کہ ان کے اشعار کسی بھی زمانے میں پڑھے جائیں ہر زمانے میں رونما ہونے والے واقعات پر ان کی تطبیق ہو سکتی ہے ہمارے اس دعویٰ کی توثیق "سات سماوات" کے اشعار سے بحسن وخوبی ہو جاتی ہے مثلاً:

آج تک اہل ستم ہی سے شکایت تھی مجھے
اب مرے باب میں ہیں اہل وفا بھی خاموش

عرفان صدیقی نے اس شعر میں ایک طرف تو قاضی شریح (جس نے امام حسینؑ کے قتل کا فتویٰ دیا تھا) اور اسی طرح کے دیگر فقیہان شہر کی عیاری کا پردہ چاک کیا ہے تو دوسری طرف ہمارے عہد میں مسلمانوں کی طرفداری کے نعرے بلند کرنے والے مصلحت پسند سیاسی لیڈران جو اقلیت کے ہمدرد وہمنوا بنتے ہیں اور قومی یکجہتی کے علمبردار کہلاتے ہیں وہ بھی جب اقلیتوں پر مظالم ہوتے ہیں تو اپنے مفاد کی خاطر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں اور ایسے موقعوں پر انہیں صرف اپنی کرسیاں عزیز ہوتی ہیں اور وہ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے بجائے اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اس شعر میں عرفان صدیقی نے نہایت خوبصورت انداز میں اس طرح کے سیاسی رہبران پر طنز ملیح کیا ہے:

سروں کو ربط رہا ہے سناں سے پہلے بھی
گزر چکے ہیں یہ لشکر یہاں سے پہلے بھی

اس شعر میں بھی دوہرے معنی پوشیدہ ہیں ایک تو یہ امام حسینؑ کی شہادت سے قبل بھی مظلوموں پر ظالموں نے ظلم وستم ڈھائے ہیں مگر وہ مظالم الگ الگ وقتوں میں الگ

الگ اقوام وقبائل کے افراد پر ہوئے لیکن کربلا میں سارے مظالم بیک وقت جمع ہو گئے اور ظلم وستم کے جتنے بھی طریقہ ہو سکتے تھے وہ سارے حسین اور خانوادہ حسین پر استعمال کئے گئے اس لحاظ سے یہ سانحہ، تاریخ انسانیت کا سب سے عظیم سانحہ ہے۔ دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اگر ہمارے عہد میں ظلم وستم کے بازار گرم ہیں اور اقلیتوں پر مظالم کا سلسلہ جاری ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہمیشہ اکثریت نے اقلیت کو جور واستبداد کا نشانہ بنایا ہے:

وہ مرحلہ ہے کہ اب سیل خوں پہ راضی ہیں
ہم اس زمین کو شاداب دیکھنے کے لئے

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ امام حسین نے دین حق کی بقا کی خاطر قربانی کو قبول کیا اور اپنا بھرا پرا گھر اسلام کو سرسبز وشاداب دیکھنے کے لئے خزاں کی نذر کر دیا دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان میں مقیم مسلمان اب اس پر بھی تیار ہیں کہ ہم پر چاہے جتنے مظالم ہوتے رہیں مگر ہمارا ملک سلامت رہے جنگ آزادی میں مسلمانوں کی بھی برابر کی حصہ داری ہے اور مسلمانوں نے بھی برابر سے قربانیاں دیں ہیں لہٰذا جس ملک کو اس قدر محنت ومشقت سے انگریزی تسلط سے آزاد کرایا ہو اب اگر اس ملک کو پھر قربانی چاہئے، پھر ہمارے لہو کی ضرورت ہے تو ہم سیل خون سے سرزمین وطن کو سرسبز وشاداب کر دیں گے کیونکہ ہمیں اپنی زمین اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے اس شعر میں ''سیل خوں'' قربانیوں کی اور ''زمین'' وطن کی علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔

''سات سماوات'' کے تجزیاتی مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عرفان صدیقی نے علامات کربلا کی بنیادی روح کو سمجھ کر عصری معنویت پیدا کی ہے یوں تو ہمارے عہد میں کربلا کے استعاراتی نظام کو شاعری میں برتنا ایک فیشن سا بن گیا ہے مگر بہت کم شعراء نے سانحہ کربلا کے افکار واقدار کی عصری معنویت کو سمجھا ہے اور اس سے دوررس نتائج برآمد کئے ہیں۔ عرض کیا جا چکا ہے ان میں سب سے اہم شاعر عرفان صدیقی ہیں۔ عرفان صدیقی نے کربلا کو ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے نہیں پڑھا اور سمجھا ہے بلکہ انھوں نے اس موضوع کی آفاقیت کو اپنی روح کی گہرائیوں میں جذب کرنے کے بعد اسے اپنی شاعری کا عنوان بنایا ہے۔

پانچواں باب

اختتامیہ:

✪ عرفانؔ صدیقی کی شاعری کا مجموعی محاکمہ

اور

معاصر اردو شاعری میں اس کی اہمیت و معنویت

گذشتہ ابواب میں عرفان صدیقی کے شاعرانہ اسلوب پر تفصیل سے گفتگو کی جاچکی ہے ان کے شاعرانہ اسلوب کی مختلف جہتیں ہیں ہم نے ان جہتوں کو بھی نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔عرفان صدیقی نے شاعری کو جولب ولہجہ دیا وہ انہیں سے مخصوص ہے۔عرض کیا جاچکا ہے کہ عرفان صدیقی ہمارے عہد کے انتہائی اہم شاعر ہیں۔شاعری میں معنوی قوت اور وسعت کے اعتبار سے وہ اپنے معاصرین میں سب سے الگ اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں زندگی کی گہری بصیرت ہے جوہم پر رازہائے سربستہ کو منکشف کرتی ہے اورہمیں معنی وخیال کی نئی دنیاؤں کی سیر کراتی ہے۔

عرفان صدیقی نے غزل کوتخلیقی سطح پر ایک نیا رنگ وآہنگ دیا ہے۔وہ روایت کا احترام ضرور کرتے ہیں مگر روایتی شاعر ہرگز نہیں ،انھوں نے کلاسیکی شاعری سے زبرست استفادہ کیا ہے جس سے ان کے لہجہ میں جدت اور طرحداری کے ساتھ ساتھ ایک خاص قسم کا بانکپن بھی پیدا ہوگیا ہے اور لہجے کی یہ طرحداری اور اسلوب کا یہ بانکپن ان کی مخصوص لفظیات سے عبارت ہے اپنی شاعری کی لفظیات کا انتخاب انھوں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے وہ اس وقت تک کسی لفظ کواپنی شاعری میں جگہ نہیں دیتے ہیں جب تک اس کے ممکنہ امکانات کوسمجھ نہ لیں۔کسی بھی لفظ کو وہ اسی وقت استعمال کرتے ہیں جب اس کے رموز واسراران پر منکشف ہوجاتے ہیں الفاظ کی معنوی قوت اور وسعت کوسمجھ لینے کے بعد جب وہ انہیں استعمال کرتے ہیں توان کے الفاظ موضوع سے اس طرح ہم آہنگ ہوجاتے ہیں

کہ ''من تو شدم تو من شدی'' کی تصویر بن جاتے ہیں۔ عرفانؔ صدیقی نے جو الفاظ اپنے اظہار کے لئے منتخب کئے ہیں وہ ان کے معاصرین کے یہاں بھی مل جاتے ہیں لیکن انھوں نے اپنی شاعری میں مستعمل لفظیات کو نئے معنوی جہات وابعاد عطا کئے ہیں اور انہیں اس سلیقے سے برتا ہے کہ ان کا طرز اظہار ان کے معاصرین سے مختلف و منفرد نظر آتا ہے اور انہیں لفظیات کے سہارے انھوں نے ایک تخلیقی دنیا آباد کی ہے جو سحر انگیز اور حیرت خیز ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعرانہ حسن کاری، لہجہ کی نغمگی اور غنائیت میں ہمیں ایک نئی شعری دنیا نظر آتی ہے۔ عرفانؔ صدیقی نے زندگی کی سفاکیوں اور المناکیوں نیز اپنے عہد اور اس عہد کے فرد کی حسرتوں اور ناکامیوں کی مدھم لیکن موثر انداز میں ترجمانی کی ہے جیسے یہ سب خود ان کی زندگی کا حصہ ہیں اور ان پر بھی یہ ساری کیفیات گزر چکی ہیں۔ عرفان صدیقی کی غزلوں میں ایک ایسے شخص کا احساس جھلکتا ہے جو یقین محکم اور عزم مصمم کے ساتھ سفر پر نکلا تھا۔ منزل متعین تھی مسافرت کی صعوبتوں سے بھی واقفیت تھی اور انہیں برداشت کرنے کا حوصلہ بھی، مگر اب چلتے چلتے وہ اس منزل پر پہنچا ہے جہاں مستقبل کی اتھاہ پہنائیوں میں کچھ بھی صاف نہیں دکھائی دے رہا ہے بلکہ سب کچھ دھندلا چکا ہے مگر اس کے باوجود شاعر مستقبل سے مایوس نہیں ہے اور وہ امید کی کرن کے سہارے آگے بڑھ رہا ہے اور اس کا سفر جاری ہے اور وہ دوسروں کو بھی مستقبل کے حوصلہ افزا خواب دکھا رہا ہے بقول شمس الرحمٰن فاروقی:

> ''کبھی کبھی کوئی ایسی کتاب بھی بازار میں آجاتی ہے جسے اپنے زمانے کی کتاب تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ آج کے شعر سے زیادہ مستقبل کا پتہ دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ کسی دور دراز گذشتہ منزل کی بھی آوازیں اس کے لہجے کی تہہ میں صاف سنائی دیتی ہیں۔''
>
> (اردو چینل، شمس الرحمٰن فاروقی نمبر، ص ۲۳۴، ج ۵، شمارہ ۴، دسمبر ۲۰۰۳، ممبئی)

اب تک کی گفتگو سے اس بات پر زور دینا مقصود تھا کہ عرفانؔ صدیقی کی غزلوں میں مربوط معنیاتی نظام اور اس نظام میں سانس لیتا ہوا ایک انسان باہم دست و گریباں ہے

لیکن اس نظام کی معنویت اور اس انسان کی انفرادیت کا انکشاف سرنامہ عرفاں کے شعری پیرایۂ اظہار کا مرہون منت ہے۔ عرفاں صدیقی جو کچھ کہتے ہیں اسے عرفان صدیقی کے پیرائے ہی میں کہا جا سکتا ہے استعاراتی اور پیکری ابہام کا ہلکا سا پردہ ان کے شعری حوالوں کو بیک وقت نہاں اور عیاں کرتا رہتا ہے۔ یہ حوالے ماضی بعید وقریب کو بھی محیط ہیں ہم انہیں اپنے عہد کے ذرائع ابلاغ تک میں دیکھ سکتے ہیں اور شاید کسی نہ کسی صورت ہمیشہ موجود رہیں گے اس لئے ان حوالوں کا تعلق انسان کے وجود اور دنیا کے ساتھ اس کی آمیزش وآویزش سے ہے۔ عرفاں صدیقی کی شعری حرفت اور فنی چابک دستی یہی ہے کہ ہم ان کے بیان کو وقت کی کسی اکائی میں محصور نہیں کر سکتے حقیقت کی اندوہناکی کا بیان ہو یا حالات کی سنگینی کا، عرفاں صدیقی اس کے لئے ایک ایسا دل آویز پیرایہ اختیار کرتے ہیں کہ ان کا ہر موضوع پرکشش معلوم ہونے لگتا ہے۔

گذشتہ ابواب میں ''کینوس'' ''شب درمیاں'' ''سات سماوات'' کا تفصیلی اور ''ہوائے دشت ماریہ'' اور ''عشق نامہ'' کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا چکا ہے۔ ہم عرفاں صدیقی کے مجموعی مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عرفاں صدیقی ایک زندہ توانا اور متحرک شاعر ہیں جن کی قوت متخیلہ نامیاتی، زرخیز اور کائنات گرد ہے۔ آخرالذکر مجموعہ ''عشق نامہ'' ان کے دیگر مجموعوں سے ذرا مختلف ہے۔ عشقیہ شاعری (Love Poetry) فی الوقت ختم سی ہوگئی ہے یا ہو بھی رہی ہے تو مبتذل اور سوقیانہ ہے مگر عرفاں صدیقی نے عشقیہ شاعری کے اس زوال آمادہ دور میں اتنی عشقیہ غزلیں کہی ہیں کہ ان کا ایک مجموعہ ہی ''عشق نامہ'' قرار پایا۔ ''عشق نامہ'' میں عشقیہ شاعری ضرور ہے مگر عرفاں صدیقی نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ کسی بھی مقام پر دامن تہذیب ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے یوں تو عشقیہ اشعار ان کے بہت سے معاصرین نے کہے ہیں مگر ان میں وہ جمالیاتی کیف و کشش نہیں ہے جو عرفاں صدیقی کے یہاں موجود ہے اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں ''عشق نامہ'' عرفاں صدیقی کا ایک اہم کارنامہ ہے لہٰذا ''عشق نامہ'' کی اپنی ایک اہمیت ہے حالانکہ ابھی اس کی طرف ناقدین ملتفت نہیں ہوئے ہیں اور اسے جتنی توجہ کی ضرورت تھی اتنی توجہ اس پر

نہیں کی جاسکی ہے۔راقم السطور نے بھی مقالہ کی حد بندیوں کی وجہ سے عشق نامہ کا بہت تفصیل سے محاکمہ نہیں کیا ہے۔

عرض کیا جاچکا ہے کہ عرفانؔ صدیقی کا شعری لہجہ ہی ممتاز و منفرد نہیں ہے بلکہ ان کا طرز احساس بھی دوسروں سے مختلف ہے اور ان کے اسلوب میں ایک خاص قسم کی تازہ کاری پائی جاتی ہے انھوں نے پرانے الفاظ میں نئی معنویت پیدا کر کے انہیں از سر نو حیات بخشی ہے۔ان کی تراکیب اور بندشیں بھی چونکا دینے والی ہوتی ہیں لفظی اور معنوی رعایت، محاورہ اور روزمرہ تک کا استعمال غیر روایتی اور انفرادی ہے انھوں نے تشبیہات واستعارات، رموز وعلائم کو اپنی غزلوں میں ان کے تلازمات وانسلاکات کے ساتھ اس طرح برتا ہے کہ ان کے جتنے بھی امکانات ہوسکتے ہیں وہ سارے روشن ہو اٹھتے ہیں لہٰذا کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری موجودہ عہد میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہے اور مفاہیم کی وسعت اور معنی کی ندرت کے اعتبار سے بہت کم شاعران کے برابر ٹھہرتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ستر کی دہائی کے بعد اردو شاعری میں عرفانؔ صدیقی نے اپنے موضوعات کی نیرنگی اور مضامین کی ندرت کی بنا پر معنی کے ایک نئے افق کو روشن کیا ہے۔ایک ہی محور پر گھومتی رہنے والی نئی شاعری کا قاری ایک سے موضوعات و مضامین کی تکرار اور یکسانی سے اکتا چکا تھا۔نئی شاعری ایک ایسے نقطے پر پہنچ گئی تھی جہاں مختلف لہجوں میں امتیاز کرنا مشکل تھا ہم کسی شاعر کو اس کے مخصوص لب ولہجہ کی بنا پر شناخت کرنے سے محروم ہو چلے تھے کسی عہد کی شاعری کے لئے اس سے بڑا زیاں اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ لہجوں کی شناخت سے محروم ہو جائے ایسے میں عرفانؔ صدیقی کا افق شعر پر نمودار ہونا فال نیک ثابت ہوا اور ہمیں ایک عرصے کے بعد ایک نئے اور تازہ ،خوش آہنگ اور منفرد لہجہ سے مانوس ہونے کا موقع ملا۔عرفانؔ صدیقی نے شاعری کی یکسانی کے اس دور میں بہت جلد اس نقطہ کو سمجھ لیا کہ پائمال مضامین سے اپنا دامن بچا کر کس طرح نئے مضامین کی جستجو کی جاسکتی ہے اور کس طرح روایتی شاعری کے آہنگ سے ایک نیا آہنگ تعمیر کیا جا سکتا ہے اس لئے انہوں نے ایک نئے نظام کی تشکیل کی اور اسی نظام سے ان موضوعات کو

تراشا جو ابھی تک ہماری نئی شاعری میں نظر نہیں آئے تھے۔

اس طرح آہنگ اور بیان کی سطح پر عرفانؔ صدیقی اپنے معاصرین میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل ہیں اور ان کی شاعری ہمیں ہمارے عہد کی نئی معنوی دنیا سے بخوبی متعارف کراتی ہے۔ اسی معنوی دنیا کی جستجو نے عرفانؔ صدیقی کو ہمارے زمانے میں ایک امتیازی اور انفرادی منصب پر فائز کردیا ہے۔

●●●

برگِ خیال

●●

مرزا شفیق حسین شفق عرفان صدیقی کی زندگی کے آخری دور میں ان کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ ان کی بیماری کے زمانے میں مرزا شفیق نے ان کی بہت خدمت کی جس کا اعتراف عرفان صدیقی نے بارہا کیا۔ انہوں نے عرفان صاحب کی شخصیت اور شاعری پر ایم۔اے۔ کا تحقیقی مقالہ بھی لکھا، یہ مقالہ اب اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں سامنے آیا ہے اور یہ عرفان صدیقی پر پہلی کتاب ہے۔

عرفان صدیقی کی مرموز شخصیت اور تہہ دار شاعری پر اور بھی کتابیں لکھی جائیں گی لیکن ان میں مرزا شفیق کی کتاب کی یہ انفرادیت برقرار رہے گی کہ یہ عرفان صدیقی پر ہونے والے اولین کاموں میں پہلا کام ہے۔

مرزا شفیق نے عرفان صاحب کی سوانح بہت محنت سے مرتب کی ہے اور اس میں ان کے انٹرویو وغیرہ اور ان کے احباب کی تحریریں بھی پیش نظر رکھی ہیں۔ عرفان صدیقی کی شاعری کا جائزہ لینا آسان نہیں ہے اور مجھے اندیشہ تھا کہ مرزا شفیق ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے لیکن انہوں نے اس کٹھن مرحلے کو اس طرح سر کیا کہ اپنی تنقید کو عام سطح پر رکھا اور عرفان صدیقی کی شاعری کے صرف بہت نمایاں پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب مقبولیت حاصل کرے گی۔

پروفیسر نیر مسعود

لکھنؤ

●●

اکتوبر ۲۰۰۴ء میں پانچ سال کی جلاوطنی کے بعد جب لکھنؤ واپس آیا تو لکھنؤ کی ادبی فضا کو سونی سونی پایا، بہت سے ساتھی راہی ملک عدم ہو چکے تھے اور انہیں جانے والوں میں میرے دو انتہائی عزیز ترین کم عمر ساتھی عرفان صدیقی اور محسن زیدی بھی شامل تھے جن

کی حیثیت میرے لئے مثل چھوٹے بھائیوں کے تھی۔ان دونوں نے جدید غزل میں اپنا منفرد مقام پیدا کرلیا تھا لیکن ہمارے ناقدین ادب نے ان کی زندگی میں ان کی شاعری کی اہم خصوصیات سے علمی دنیا کو باخبر نہیں کیا جبکہ غزل کے جدید رجحانات کے تحت معانی و بیان میں عرفان صدیقی نے جو گلکاریاں کی ہیں اس کی مثال جدید غزل گویوں کے تخلیقات میں مشکل ہی سے ملے گی۔

مجھے خوشی ہے کہ عزیزم مرزا شفیق حسین شفق نے کم از کم عرفان صدیقی کے سلسلے میں اس خدمت کو انجام دیا۔انہوں نے اپنے مقالے ''عرفان صدیقی: شخص اور شاعر'' میں عرفان صدیقی کے علمی اور شاعرانہ بیک گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ اردو غزل کے ارتقاء پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ترقی پسند تحریک جو ایک خاص نظریہ سے وابستہ ہونے کے سبب از کار رفتہ ہو گئی تھی اس کی تاریخی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے غزل کے نئے مضامین اور اسالیب پر تفصیل سے بحث کی ہے۔اور عرفان صدیقی کے ادبی مقام کا تعین کیا ہے۔

عزیزم شفیق حسین شفق نے جس خوبی سے ان کے کلام کا تجزیہ کیا ہے اور اس پر روشنی ڈالی ہے وہ باعث ستائش ہے ان کا مقالہ عرفان صدیقی کی شاعری کے حوالے سے نقش اول ہے حالانکہ ادھر عرفان صدیقی پر کئی رسالوں نے خصوصی گوشے شائع کئے ہیں اور جیسا کہ میرے علم میں ہے کہ ہند و پاک کی کئی دانش گاہوں میں عرفان صدیقی پر ریسرچ ہو رہی ہے اور تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں مگر ان سب کے درمیان مرزا شفیق کے مقالے کی حیثیت ایسی ہی ہو گی جیسے ستاروں میں چاند کی ہوتی ہے۔

پروفیسر ولی الحق انصاری

لکھنؤ

●●

عرفان صدیقی نئی اردو غزل کا ایک اہم نام ہے جس نے غزل کو ایک بحرانی دور میں معنوی وسعت دی اور اس کی بنیادی دلکشی کو قائم رکھا۔عرفان صدیقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے غزل کو فکر و نظر کی تازگی دی۔غزل کی روایت کے پورے

احترام کے ساتھ اسے تازہ کار علائم کے ساتھ پیش کرنا ایسا آسان نہیں تھا لیکن عرفان صدیقی نے تازہ ہوا کے لئے نئی کھڑکیاں کھول دیں۔

مجھے خوشی ہے کہ مرزا شفیق حسین شفق نے عرفان صدیقی کی شاعری پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر ان کے افکار کا تفصیلی مطالعہ کرنے کا موقع دیا۔ میرا خیال ہے کہ عرفان صدیقی کی شاعری پر 'عرفان صدیقی: شخص اور شاعر' پہلی کتاب ہے جس میں تفصیل سے ان کے کلام کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مرزا شفیق حسین شفق نوجوان ادیب وخطیب اور ناقد ہیں وہ ایک سلجھا ہوا ذہن رکھتے ہیں ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ مستقل علمی وادبی کاموں میں مصروف ہیں۔ عرفان صدیقی پر انہوں نے بڑے سلیقے اور خوش اسلوبی کے ساتھ کام کیا ہے۔ بعض جگہوں پر اپنے فیصلوں میں وہ جذباتی ہو گئے ہیں شاید وہ ان کی عمر کا تقاضہ ہے لیکن ان کی تحریروں میں ایک اچھے ناقد کی صلاحیت اور بصیرت قدم قدم پر نظر آتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اسی طرح اپنی منزلوں کی طرف گامزن رہیں گے۔

پروفیسر شارب ردولوی
لکھنؤ

●●

سیَر وسوانح نگاری میں سب سے نازک مرحلہ شخصیت کی پیش کش کا ہوتا ہے اس لئے کہ ہر شخصیت کے پس منظر میں اس کا شجرہ نسب، خاندان، اس کے احباب، ماحول، وراثت اور اگر وہ شخصیت ادبی ہے تو ادبی پس منظر بھی ناگزیر ہو جاتا ہے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان سب عوامل میں جو باہمی تفاعل ہوتا ہے اس کی نشاندہی کے بغیر قاری شخصیت کے مرتبہ اور قدر وقیمت کا تعین نہیں کر سکتا۔

مرزا شفیق حسین شفق نفسیات کے ان باریک رموز ونکات سے واقف وباخبر ہیں انہوں نے عرفان صدیقی کی شخصیت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری گزرگاہ خیال پر یہ محسوس کرتا ہے جیسے وہ عرفان صدیقی کے خاندان کا ایک فرد ہے شفق کے اسلوب میں یہ

خصوصیت ہے کہ وہ جس کردار کو پیش کر رہے ہیں وہ متحرک نظر آتا ہے قاری کو ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ عرفان صدیقی سے ہم کلام ہے اور ان کے شعری اسلوب سے صرف آشنا نہیں ہے بلکہ خود کو اس سے ہم آہنگ پاتا ہے یہ بہت بڑی بات ہے کہ شخصیت کی تعمیر میں شعری خصوصیات کا تذکرہ اس طرح کیا جائے کہ وہ خصوصیات شخصیت کا جزو معلوم ہوں۔ شفق نے بڑے خوبصورت انداز میں اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ عرفان صدیقی کے یہاں جو رمزیت وایمائیت ہے وہ ان کے اور قاری کے درمیان نہایت نازک رشتوں کی تخلیق کرتی ہے۔ شفق کا اسلوب متاثر کن ہے اور قاری کے سامنے معروضی متحرک مرقعے پیش کرتا ہے۔

پروفیسر سید مجاور حسین رضوی

الہ آباد

●●

نوجوان نقاد مرزا شفیق حسین شفق کی کتاب ''عرفان صدیقی: شخص اور شاعر'' عرفان شناسی کی راہ میں پہلا قدم ہے اگر چہ یہ عرفان صدیقی کی شاعری کا مکمل اور مفصل احاطہ نہیں ہے لیکن یہ عرفان صدیقی کی شاعری کا لائق تحسین محاسبہ ضرور ہے اور عرفان صدیقی کی شخصیت اور فن پر قلم اٹھانے والوں کے لئے آئندہ یہ کتاب حوالے کا کام کرے گی۔

عرفان صدیقی اردو کے ایک اہم اور نمائندہ شاعر تھے اور انہوں نے انتہائی عمدہ شاعری کی تخلیق کی۔ یہ ضرورت مدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ ان کے فن کا تفصیل سے احاطہ کیا جائے، مجھے خوشی ہے کہ مرزا شفیق حسین شفق نے یہ کام بہ حسن وخوبی کر دکھایا اور اردو کے بڑے اور اہم نقادوں کو عرفان صدیقی کے مسلسل نظر انداز کئے جانے کا احساس دلایا۔ مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ یہ کتاب ایم۔اے۔ کا لکھا ہوا مقالہ ہے جبکہ عام طور پر ایم۔اے۔ کے مقالے اس طرح نہیں لکھے جاتے ہیں مجھے اس مقالہ کو دیکھ کر یگانہ پر لکھا ہوا راہی معصوم رضا کا مقالہ یاد آرہا ہے ایم۔اے۔ کے اس مقالہ کے بعد یہ دوسرا مقالہ ہے۔ جس نے مجھے متاثر کیا ہے۔

پروفیسر شہریار

علی گڑھ

●●

موجودہ شاعری کی جانب سے عمومی طور پر بے زاری اور بے دلی کا برملا اظہار ادب کے قارئین بار بار کرتے رہے ہیں کیونکہ شاعری کے نام پر ایک تخلیقی بانجھ پن اور فکری دیوالیہ پن کے ساتھ اس صنف کا منظر نامہ برسوں سے ہزار بار کے چبائے ہوئے نوالوں پر بسر کر رہا ہے اور انبوہ زوال پرستاں اسی سے مطمئن بھی ہے لیکن اس خشک، زوال آمادہ اور مری مٹی پر عرفان صدیقی نے از سر نو گڑائی کر کے اسے دوبارہ سرسبز و شاداب اور برگ آور بنایا۔

نقادوں کی بے حسی کا رونا اپنی جگہ لیکن کئی اعتبار سے وہ فنکار خوش قسمت ہوتے ہیں جن پر دیر سے کام شروع ہوتا ہے وہ بھی باذوق، باصلاحیت، باوسائل اور محنتی طالب علم کے ہاتھوں، نہ کہ بوڑھے، از کار رفتہ، مصلحتوں میں گرفتار، ٹھپّے دار اور گروہ باز قسم کے ٹکسالی نقادوں کے ہاتھوں، جن کی ایک ہی پٹی پٹائی تنقید جادو کے زور سے کسی بھی شاعر پر منطبق ہو جایا کرتی ہے۔ عرفان صدیقی اس معاملہ میں خوش قسمت ہیں کہ ان کی شاعری کا پہلا نقاد ایک نوجوان طالب علم ہے اور اس نوجوان نے اپنی ذہانت و ذکاوت سے ادب کے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے، یہاں میری مراد مرزا شفیق حسین شفق سے ہے، جنہوں نے ایک انتہائی مشکل کام کا بیڑا اٹھایا اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا، خوشی کی بات یہ ہے کہ مرزا صاحب نے اس منفرد شاعر پر جس طرح سے کام کرنے کی ٹھانی اسی طرح یہ سرخرو بھی ہوئے۔ دلیل یہ ہے کہ عرفان صدیقی کے فن و شخصیت پر ان کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل کر ختم ہو چکا ہے۔

اقبال مجید

بھوپال

●●

مرزا شفیق حسین شفق ہمارے ان نوجوان ناقدین میں ہیں جو اگر ایک طرف واقعات کربلا کے رمز شناس ہیں تو دوسری طرف اردو شعر و ادب کی سمت و رفتار پر بھی عالمانہ نگاہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے عرفان صدیقی کے کلام کی جو تعبیر و تفسیر پیش کی ہے اور جس

تنقیدی بصیرت کے ساتھ اُن کے کلام کا جائزہ لیا ہے اس کی داد نہ دینا ادبی بد دیانتی کے مترادف ہوگا۔

یہ سچ ہے کہ علم و دانش، تلاش و تحقیق اور جستجو و آرزو کی کوئی منزل، منزل آخر نہیں ہوتی مگر اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ عرفان صدیقی کے فکر و فن پر آئندہ جو کچھ بھی لکھا جائے گا مرزا شفیق کی کتاب 'عرفان صدیقی: شخص اور شاعر' بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھے گی اور اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا ناممکن ہوگا۔ انہوں نے جدید اردو غزل کا جو پس منظر تیار کیا ہے اور اس سلسلے میں اپنے افکار و خیالات کی جو توضیح کی ہے وہ بے حد متوازن اور معتبر ہے۔

مرزا شفیق لکھنؤ یونیورسٹی میں میرے شاگرد رہے ہیں اور ابتدا ہی سے انہیں دین و ادب کے موضوعات پر مطالعہ کا شوق رہا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عرفان صدیقی کو اپنا موضوع بنایا اور میں بڑی ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ عرفان صدیقی کا حق وہی ادا کر سکتا ہے جو ہمارے ادب کی سمت و رفتار، ہماری مذہبی تاریخ اور روایات سے خاطر خواہ واقفیت رکھتا ہو۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد
لکھنؤ

●●

عرفان صدیقی کی غزل گوئی اردو غزل کے نئے امکانات کو واضح کرتی ہے اور انہیں بجا طور پر ''رجل غزل'' کہا جا سکتا ہے انہوں نے غزل کے دائرے کو وسعت عطا کی ہے اور اس کا غنائی مزاج اور آہنگ بڑی فنکاری سے متعین کیا ہے فاضل مصنف نے نئی غزل کے شعراء کے اشعار کا انتخاب پیش کرتے ہوئے عرفان صدیقی کے اشعار کو بھی سامنے رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عرفان صدیقی نے جدیدیت کے سیلاب میں بھی حرمت غزل کی تطہیر کو ہر حال اور ہر طور باقی رکھا ہے۔ مرزا شفیق حسین شفق نے یہ کتاب لکھ کر بہت مفید کام انجام دیا ہے اس سے عرفان صدیقی کی شاعری پر غور و خوض کرنے والوں کو مدد ملے گی۔

پروفیسر فضل امام رضوی
الہ آباد

●●

مرزا شفیق حسین شفق سے میری شناسائی "باب شہر علم" کے "میر انیسؔ نمبر" کے توسط سے ہوئی۔ ان کی ادارت میں نکلنے والا یہ جریدہ مذہبی اور ادبی دونوں ہی حلقوں میں یکساں مقبول تھا۔ شفق کی رثائی ادب پر گہری نظر ہے، رثائی ادب کے ساتھ وہ جس ربودگی، شیفتگی اور شگفتگی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں اس کی بنا پر وہ ایک وسیع کائنات رزم و بزم کے اداشناس نقاد کی صورت میں امتیاز واستناد کا درجہ حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ عرفان صدیقی پر ان کی کتاب "عرفان صدیقی: شخص اور شاعر" عصری منظرنامہ پر اپنا نقش مرتسم کر چکی ہے ان کے تنقیدی مضامین بھی اکثر رسائل میں نظر سے گزرتے رہتے ہیں، ان کے مضامین اور تقاریر پر مشتمل دیگر کتابیں بھی میرے مطالعہ میں رہی ہیں جو ان کی روشن ضمیری پر دال ہیں۔ شفق نے عرفان صدیقی کی شخصیت اور شاعری کا عمیق مطالعہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے ضمن میں تلاش وتحقیق کی نئی شمعیں روشن کی ہیں۔ یوں تو ان کی کتاب کے سبھی ابواب ان کے استغراق کا پتہ دیتے ہیں لیکن غزل کے نئے افکار واقدار پر انہوں نے نہایت دل جمعی کے ساتھ اپنی ممکنہ تنقیدی بصارت وبصیرت کا اظہار کیا ہے۔ نیز عرفان صدیقی کے امتیازی لہجے اور انفرادی اسلوب کا تجزیہ ومحاکمہ نہایت خوبی کے ساتھ دل پذیر اسلوب میں کیا ہے۔ کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ لفظوں کی رنگولی سجاتے وقت مصوری کے آداب کو نہ صرف ملحوظ رکھتے ہیں بلکہ ایسے نقش جگاتے ہیں جو روشنی کی طرح تادیر ہمیں مسحور رکھتے ہیں۔ انہوں نے عرفان صدیقی کی مخصوص لفظیات وعلامات خصوصاً اردو شاعری کے تخلیقی رجحان سانحۂ کربلا کو بڑی دقت نظر کے ساتھ موضوع سخن بنایا ہے۔ یہ بات پورے ایقان وایمان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مرزا شفیق حسین شفق کی اس ابتدائی اور بنیادی کاوش میں نقد ونظر کا جادو ایک زیریں لہر کی طرح دمکتا، چمکتا اور ہماری آنکھوں کو خیرہ کرتا نظر آتا ہے ابھی ان کے ادبی سفر کا آغاز ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں خوب سے خوب تر کی تلاش وجستجو کا سلسلہ نہ صرف جاری وساری رہے گا بلکہ ادب کی دنیا میں نشان امتیاز وانفراد بھی قائم کرے گا۔ ان کی تحریر کی سلاست اور روانی اور شگفتہ مزاجی سے یہ تاثر بھی قائم ہوتا ہے کہ وہ اپنے خیالات وافکار کو

بہت صفائی اور حسن آمیزی کے ساتھ ظاہر کرنے کے فن میں بے حد مشاق ہیں۔

فیاض رفعت

ممبئی

●●

گذشتہ تین دہائیوں میں ہندوپاک کے اگر کسی ایک غزل گو نے اپنی قابل رشک تخلیقی فطانت، فنی اظہار پر ماہرانہ دسترس، زندگی کے مانوس حقائق کو حسی تجربہ کے طور پر منقلب کرنے کی سعی پیہم سے اہل نظر کو متوجہ کیا تو اس شاعر کا نام عرفان صدیقی ہے۔ تاہم یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ اردو کے سربرآوردہ نقادوں نے عام مجلسوں یا رسائل میں عرفان صدیقی کی تخلیقی کاوشوں کا تو برملا اعتراف کیا اور ہندوپاک کے اہم جرائد ان کا کلام بڑے اہتمام سے شائع کرتے رہے مگر ان کی شاعری کی قرار واقعی تعین قدر کی کوشش بہت کم کی گئی ہے۔ اردو تنقید کے ناقد پر جو قرض ہے اسے بحسن وخوبی اتارنے کی کوشش اردو کے نوجوان ادیب اور نقاد مرزا شفیق حسین شفق نے کی ہے اور ان کی کتاب عرفان صدیقی کے شعری اکتسابات اور فنی امتیازات خاصی دقت نظر کے ساتھ واضح کرتی ہے۔

مرزا شفیق حسین شفق نے عرفان صدیقی کے سوانحی کوائف اور شخصی گوشوں پر دلجمعی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے اور پھر تیسرے چوتھے ابواب میں عرفان صدیقی کے مابہ الامتیاز عناصر کی نشاندہی کے عمل کو شعری متن کے خیال انگیز تجزیاتی مطالعے سے ہم آہنگ کیا ہے۔ ہر چند کہ شفق ایک جواں سال ادیب ہیں مگر انہوں نے سیال تنقیدی اصطلاحوں اور عمومیت سے عمداً اجتناب برتا ہے جو ان کی تنقیدی بصیرت پر دال ہے۔ ادب میں زندگی کا التباس اس قدر قوی ہوتا ہے کہ عموماً اسے روزمرہ کے خارجی واقعات کے فنی اظہار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ الفاظ خارج میں موجود کسی شے کی نمائندگی کرتے ہیں جب کہ الفاظ کسی شے کی نمائندگی کرنے کے بجائے فی نفسہ ایک تخلیقی عرصہ (Creative Space) کی تشکیل کرتے ہیں اور حقیقت بھی وہی ہے جسے ہم اپنی ثقافتی یا تہذیبی ضروریات کی تکمیل کی خاطر الفاظ کی وساطت سے خلق کرتے ہیں۔ اس تنقیدی نکتہ تک رسائی عام نہیں ہے، مقام

مسرت ہے کہ مرزا شفیق اس امر سے واقف ہیں اور وہ عرفان صدیقی کے کلام میں لفظ کی انسلاکاتی اور دلالتی تعبیروں پر اصرار کو موضوع بحث بناتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عرفان صدیقی کے کلام میں روز مرہ، محاورہ، استعارہ، اور تمثیل کا جو استعمال ملتا ہے وہ عموماً کسی معروض کی نمائندگی کے بجائے اپنے آپ میں الفاظ کو معروض (Object) کی حیثیت سے برتنے پر قائم ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ بجائے خود انسانی تجربے یا تصور کائنات کی تخلیق کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ وہ مناسبت یا تضاد جس کو لفظوں کی سطح پر روا رکھا گیا ہے وہ کائنات کے متناسب یا متضاد نظام کو نئے سرے سے مرتب کرتا ہے۔'' (عرفان صدیقی: شخص اور شاعر، ص ۱۱۱) یہ مختصر سی کتاب حیرت انگیز طور پر اس نوع کی تنقیدی (Insights) سے بھری ہوئی ہے۔

مرزا شفیق حسین نے عرفان صدیقی کے اشعار کو مرتکز آمیز مطالعہ کا ہدف بنایا اور اپنی تجزیاتی صلاحیت کا وافر ثبوت پیش کیا ہے۔اشعار کے تجزیے خاصے خیال انگیز ہیں۔

شعر کو ایک تہذیبی معروض کے طور پر پڑھنے کا چلن اردو میں عام نہیں ہوا ہے۔ مرزا شفیق نے عرفان صدیقی کے کلام کے ثقافتی تناظر کو واضح کر کے ان کی شاعری کے معنیاتی نظام پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر مصنف کو اس کی کاوش کی داد نہ دی جائے۔ مرزا شفیق کی زبان تنقیدی اصطلاحوں کے بے محابا استعمال سے گرانبار نہیں ہے، ان کی تنقید میں افہام و تفہیم کی مانوس فضا ملتی ہے۔

پروفیسر شافع قدوائی

علی گڑھ

●●

عرفان صدیقی جدید غزل کے ایسے شاعر تھے، جو شعری روایات اور کلاسیکی شاعری کی تہذیب سے کماحقہ واقف تھے اور وہ ان سے تخلیقی سطح پر استفادہ بھی کرتے تھے۔یہی ان کی شاعری کا امتیازی وصف بھی تھا۔عرفان صدیقی کی وسیع و عریض شعری کائنات، عشقیہ شاعری سے شروع ہو کر تصوف کے الہامی عرفان سے گزر کر، داخلی کرب کے احساسِ جمال کا خوبصورت اظہار بن جاتی ہے۔ عرفان صدیقی کو کسی خاص رجحان کا شاعر قرار دینا ان کی شاعری کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

ہمہ جہت موضوعات کا محاکمہ کرنے والے عرفان صدیقی کی شاعری اور فن پر ایک مبسوط کتاب کی تصنیف کسی بھاری پتھر کو چومنے جیسا کام تھا، لیکن مرزا شفیق حسین شفق نے اپنی کتاب 'عرفان صدیقی: شخص اور شاعر' میں اس مشکل کام کو اپنی محنت شاقہ سے ممکن بنا دیا ہے۔ ان دنوں کسی قلمکار کے فن و شخصیت پر جس نوع کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں وہ نہ تو مونوگراف کے زمرے میں آتی ہیں اور نہ ہی انتقادی مطالعہ کی ذیل میں رکھی جا سکتی ہیں۔ ایسی کتابیں ممدوح کی خوشنودی یا خوشامد کا حیلہ معلوم ہوتی ہیں جس میں ممدوح کی اپنی ذاتی دلچسپی ہوتی ہے۔ مرزا شفیق حسین نے عرفان صدیقی کی شخصیت اور فن کا جس بسیط نظری سے مطالعہ پیش کیا ہے، وہ عرفان صدیقی کی شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کسی دستاویز سے کم نہیں ہے۔ عرفان صدیقی بڑی حد تک صوفی منش انسان تھے، وہ اپنی شاعری کی تعریف و تحسین کے خواہشمند کبھی نہیں رہے، اس کے باوجود زیر نظر کتاب کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اگر ان کی زندگی میں یہ کتاب شائع ہوتی تو وہ اپنے بے نیازانہ مزاج کے باوجود کتاب کے وقیع مواد کو دیکھ کر ضرور مطمئن اور خوش ہوتے۔

ساجد رشید
ممبئی

●●

عرفاؔن صدیقی کی شخصیت اور شاعری کے سلسلے میں نقادوں نے بہت بخل سے کام لیا ہے۔ مرزا شفیق حسین شفق نے اس ادبی فریضے کو پورا کرنے اور اس قرض کو ادا کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ شروع میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ عرفاؔن صدیقی کے پہلے مجموعے ''کینوس'' کے شائع ہوتے ہی اس پر ابن فرید، منظور ہاشمی اور فرحت احساس جیسے معتبر ادیبوں اور شاعروں کے تفصیلی تبصرے مضامین کی شکل میں سامنے آگئے تھے۔ اس کے بعد عرفان صدیقی کی شاعری جیسے جیسے بردبار اور ثمر دار ہوئی ان کے تئیں نقادوں نے از حد بے نیازی کا رویہ اپنانا شروع کر دیا۔ اس کے اسباب کیا تھے یہ بات تفصیل کی طالب ہے لیکن اس کا ایک بڑا سبب خود عرفان صدیقی کی گوشہ نشینی، بے نیازی اور قبول عام کے

واسطے ہاتھ پاؤں مارنے سے دوری برتتا تھا۔

مرزا شفیق نے پہلی بار اپنے دور کے بے حد اہم معتبر اور بڑے شاعر پر تفصیل سے لکھا، ان کی شاعری کے اسباب وعلل سے لے کر اس شاعری سے پیدا کردہ نتائج کو معرض تحریر میں لائے۔ مرزا شفیق کا انداز فکر تحقیقی اور ردعمل خالص تنقیدی ہے لیکن یہ وہ تنقید ہے جو تخلیق کار کے داخل سے ہم آہنگ ہو کر متن کے اندرون تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے اور جگہ جگہ معاصر تنقید کی مروّجہ اصطلاحوں کے بے جا استعمال سے گریز کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مرزا شفیق نے عرفان صدیقی کی شاعری پر تنقید کرتے وقت اس بات کا شعوری التزام کیا ہے کہ وہ شاعری کی تہہ میں جا کر دیکھیں کہ اس کے متن کی جڑیں کس مٹی میں پیوست ہیں یوں ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا شفیق کی تنقید نے عرفان صدیقی کی غزل کی رفاقت کا حق ادا کیا ہے اور خوب کیا ہے۔

سید محمد اشرف

دہلی

●●

عرفان صدیقی کی شاعری کے بغور مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے تمام تر نئے خیالات کے باوجود روایت سے اس کا رشتہ برقرار ہے، عقلمند و ہوشمند شاعر اپنی روایت و تہذیب اور تاریخ سے یکسر کٹ بھی نہیں سکتا۔ مجھے عرفان صدیقی دوسرے شاعروں سے الگ اس لئے بھی لگے کہ انہوں نے اپنا ایک مخصوص ڈکشن تیار کیا جس کے لئے انہوں نے ایک منفرد اسلوب، لہجہ اور لفظیات کا انتخاب کیا۔ یہ سارے کام انہوں نے لاشعوری طور پر کئے یا شعوری طور پر، یہ غور طلب بھی ہے اور بحث طلب بھی۔

عرفان صدیقی نے اپنی زندگی میں خاصی شہرت پائی، کچھ منصوبہ بند طریقے سے انہیں پیش بھی کیا گیا پھر بھی یہ شکایت ہے اور شاید غلط نہیں کہ عرفان صدیقی جیتے جی اتنے اہم شاعر ہونے کے باوجود ذمہ دار نقادوں کی توجہ سے محروم رہے یا ان کے بارے میں کم لکھا گیا۔ یہ تنقید و تخلیق کے رشتے بھی عجیب ہوتے ہیں، اگر کوئی شاعر تنقید کی مداخلت یا وکالت کے بغیر اپنی اہمیت منوا لے تو میں اسے شاعر کی غیر معمولی کامیابی اور تخلیق کی کامرانی

تصور کرتا ہوں جو معاصر عہد میں عرفان صدیقی نے کر دکھایا۔ عرفان صدیقی کی شاعری میں علامتوں کی رمزیت بلکہ پیچیدگی قارئین کو امتحان میں مبتلا اور نقادوں کو متحیر کر دیتی ہے۔ یہی تحیر عرفان کی کامیابی ہے۔

ایسے میں مبارکباد کے مستحق ہیں جناب مرزا شفیق حسین شفق کہ جس راہ پر چلنے میں بڑے بڑے نقادوں کے قدم متزلزل ہوں اس راہ کو انہوں نے اپنے لئے منتخب کیا اور جس موضوع پر ایک مضمون لکھنے میں ہی اچھے اچھوں کو چھینکیں آ جائیں اس پر انہوں نے نہ صرف ایک مضمون بلکہ ایک مکمل کتاب لکھ دی۔ عرفان صدیقی کی شخصیت و شاعری پر مکمل ایک کتاب لکھنا ایک چیلنج سے کم نہیں وہ بھی ایک نوجوان کے لئے، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ چیلنج کا سامنا ایک شفاف اور نوخیز ذہن ہی کر سکتا تھا کیونکہ بڑے نقاد کا بڑا ذہن ایک کام کے لئے دس بار سوچتا ہے اور پھر مصلحت کے دائرے میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔

مرزا شفیق کی یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں رسمی تعارف کے طور پر دو ایک باب ضرور ہیں لیکن تیسرے اور چوتھے باب میں اس نوجوان نے جس طرح عرفان صدیقی کی علامات، لفظیات اور واقعہ کربلا کی تاریخی اہمیت و معنویت کو اجاگر کیا ہے وہ قابل غور ہے اور قابل قدر بھی۔ ان کی یہ کتاب اگرچہ عقیدت مندانہ ذہن کو ظاہر کرتی ہے تاہم بڑی حد تک انہوں نے غیر جانب دارانہ رویہ اپنایا ہے اور مناسب نتائج اخذ کئے ہیں۔

پروفیسر علی احمد فاطمی

الہ آباد

●●

عرفان صدیقی اردو کے شعری منظر نامے پر اس وقت نمودار ہوئے جب نہ صرف اردو شاعری بلکہ ہمارا پورا ادب انتشار کا شکار تھا اور تخلیق کار لایعنیت، بے معنویت اور مہمل گوئی میں گویا ایک دوسرے پر سبقت حاصل کر رہے تھے اور یہی نئی شاعری کا اختصاص بن چکا تھا۔ اردو ادب کے ایسے پر آشوب دور میں عرفان صدیقی اپنے پہلے مجموعے ''کینوس'' کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور شعری منظر نامے پر ایک خوشگوار ہلچل مچاتے ہیں۔ ان کا یہ

مجموعہ اسلوب کی تازہ کاری اور معنی کی ندرت کے سبب ایک اچھی شاعری کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہے۔اس کے بعد شب درمیاں، سات سماوات، ہوائے دشت ماریہ اور عشق نامہ جیسے چار مجموعے عرفان صدیقی کی شعری حیثیت کو مزید مستحکم، مسلم اور نمایاں کرنے کے لئے پڑاؤ ثابت ہوئے اور ان کا یہ دعویٰ:

کوئی سلطان نہیں میرے سوا میرا شریک
مسند خاک پہ بیٹھا ہوں برابر اپنے

محض دعویٰ نہیں حقیقت معلوم ہونے لگتا ہے۔نقادان ادب کے نظر انداز کرنے کے باوجود ان کی یہ حیثیت مسلم رہی اور رہے گی۔

'عرفان صدیقی: شخص اور شاعر' نوجوان نقاد مرزا شفیق حسین شفق کی تنقید کا نقش اول ہے، حیرت ہوتی ہے کہ ایم.اے. کے لئے لکھا گیا یہ مقالہ اتنا جامع اور بھر پور ہے کہ عرفان صدیقی کے شعری محاسن کو پوری طرح روشن کر دیتا ہے،اس میں مرزا شفیق کی علمی، ادبی،فکری اور فنی صلاحیتیں پوری طرح سے ظاہر ہو رہی ہیں اور ان کی یہی خوبیاں مستقبل کے ایک اہم نقاد کی نشاندہی کر رہی ہیں۔

ابرار رحمانی

دہلی

●●

'عرفان صدیقی: شخص اور شاعر' میں مرزا شفیق نے نہایت دیانت داری اور بالغ نظری کے ساتھ عرفان صدیقی کی ہمہ جہت شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کا فکر انگیز جائزہ لیا ہے جو یقیناً عرفان شناسی کے لئے ایک گراں قدر دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور مزید کام کرنے والوں کے لئے ایک نہج کا تعین کرتا ہے۔مرزا شفیق نے اپنی کتاب میں عرفان صدیقی کی شاعری اور ان کی قاموسی شخصیت کو بحسن وخوبی منعکس کیا ہے مجھے امید ہے کہ ادبی حلقوں میں ان کی وقیع علمی کاوش اور تنقیدی بصیرت کا اعتراف کیا جائے گا۔

ارشاد امروہوی

لکھنؤ

●●

جدید تر غزل میں عرفان صدیقی نے ایک بے نظیر نقش مرتب کیا ہے ان کی ناوقت موت سے ہم عصر اردو غزل کو بڑا بھاری خسارہ ہوا ہے۔ جواں سال ناقد مرزا شفیق حسین شفق نے اس کتاب میں عرفان صدیقی کی غزل کے محاسن کے تمام پہلوؤں کا ناقدانہ جائزہ لے کر ہم عصر اردو شاعری میں ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ عرفان صدیقی پر یہ پہلی کتاب ہے لیکن امید ہے کہ یہ کتاب عرفان صدیقی کی تفہیم اور تعین قدر کے لئے امکانات کا در کھولے گی۔

خورشید اکرم

دہلی

●●

مرزا غالب کو شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا تھا لیکن مرزا شفیق نے مقالہ لکھنے کے لئے جس شاعر کا انتخاب کیا اس نے انہیں سرخرو کر دیا ہے چانچہ مرزا شفیق اپنی کتاب ''عرفان صدیقی: شخص اور شاعر'' کے حوالے سے ادبی حلقوں میں نہ صرف معتبر بلکہ قابل قدر اور لائق تحسین ہو گئے ہیں بڑی بات اس ضمن میں یہ ہے کہ یہ عرفان صدیقی پر پہلی کتاب ہے جو عرفان شناسی اور عرفان فہمی کے سلسلے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور عرفان صدیقی پر مزید کام کرنے والے اسکالرز کے لئے یقیناً مشعل راہ ثابت ہو گی۔

شاہنواز قریشی

لکھنؤ

●●

'عرفان صدیقی: شخص اور شاعر' مرزا شفیق حسین شفق کا ایم.اے. کا تحقیقی مقالہ ہے جو انہوں نے ۲۰۰۲ء میں اردو کے ممتاز شاعر عرفان صدیقی کی شخصیت اور فن پر سپرد قلم کیا تھا اس مقالے میں کچھ ترمیم واضافہ کے بعد اب انہوں نے اسے کتابی شکل میں پیش کیا ہے اور اس طرح عرفان صدیقی کی شخصیت اور شاعری پر یہ پہلی کتاب ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری پر لکھنا آسان نہیں ہے ابھی تک ان کی شاعری کا تفصیلی محاکمہ سامنے

نہیں آیا ہے۔ چند مضامین ضرور لکھے گئے ہیں جن سے ان کے کلام کو سمجھنے میں کچھ مدد ضرور ملتی ہے۔ ایسی صورت میں ایک اہم اور معتبر شاعر پر کتاب لکھنے میں اولیت حاصل کرنا یقیناً مرزا شفیق کے لئے بڑی سعادت کی بات ہے۔ آنے والے دور میں جب عرفان صدیقی کی شاعری پر تفصیل سے لکھا جائے گا اور نئی دریافتیں ہوں گی اس وقت بھی اس کتاب کی حیثیت بہر حال ایک بنیادی حوالے کی ہوگی۔

محمد مسعود

لکھنؤ

●●

'عرفان صدیقی: شخص اور شاعر' مرزا شفیق حسین شفق کی تازہ ترین تنقیدی تصنیف ہے۔ یہ شعر و سخن کی باریکیوں اور فن کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں جس کا ثبوت خود یہ کتاب ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے عرفان صدیقی کے کلام کے ساتھ جدید شاعری کا بھی عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب میں مرزا شفیق نے عرفان صدیقی کی شاعری کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار بڑے مدلل انداز میں کیا ہے نیز عرفان صدیقی کے ان اشعار کی تشریح بہت معنی خیز انداز میں کی ہے جن میں سانحۂ کربلا کے تلازمات کا استعمال ہوا ہے۔ مرزا شفیق نے نہایت دیانت داری سے عرفان صدیقی کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔ اور ان کی مرموز شخصیت کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔

ڈاکٹر ریشماں پروین

علی گڑھ

●●

غالباً میں نے پہلی مرتبہ عرفان صدیقی کا نام مرزا شفیق حسین شفق کی زبان سے سنا تھا اور عرفان صدیقی کو انھیں کے قلم سے پڑھا بھی۔ کسی نیچرل شاعر کی شخصی اور اس کے تخلیقی رموز و اوقاف کی نصاب بندی کا عمل بہت ہی مشکل کام ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ مشکل اس کی شاعری کے ظاہری اور معنوی ابعاد و جہات کی حد بندی، فنی آداب اور اس کی ادبی تہذیب کے حساب سے کرنا۔ یہ مشکل مرحلہ بغیر تنقیدی بصیرت کے طے نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ ایسے مشکل مرحلے میں اکثر نقاد نفسیاتی کشمکش کے شکار ہو جاتے ہیں اور کسی

بڑے شاعر کی تخلیق سے متاثر ہونے کے بجائے اس کی شخصیت سے مرعوب ہوجاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ان کا قلم شعوری طور پر تنقیدی خیانت کے ارتکاب میں تکلف نہیں کرتا حالانکہ ایسا کرنا تنقیدی اصولوں کے خلاف ہے۔ مرزا شفیق حسین شفق کی اہم خوبی یہی ہے کہ یہ کبھی کسی بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ جو کچھ بھی لکھتے ہیں اس کے فن سے متاثر ہو کر ہی لکھتے ہیں یہی ایک سچے اور اچھے نقاد کی پہچان ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعری کے حوالے سے یہ بات سب جانتے ہیں کہ مرزا شفیق حسین شفق عرفان صدیقی کی شاعری کے پہلے نقاد اور سوانح نگار ہیں۔ اس کتاب کی تنقیدی اور سوانحی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس موضوع کے ضمنی لاحقہ کے طور پر یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ ایک نقاد کو جملہ اوصاف کے ساتھ استخراج واستنباط اور لفظوں کی ظاہری ومعنوی حقیقتوں کا رمز شناس ہونا بھی ضروری ہے۔ اس لئے کہ کسی تخلیق کو ایک معیار عطا کرنے میں ایک نقاد کا اہم کردار ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا شفیق حسین شفق میں یہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ 'عرفان صدیقی: شخص اور شاعر' ان کی ناقدانہ صلاحیتوں پر دال ہے۔

عرفان صدیقی کی شاعری کے حوالے سے ان کا یہ اقدام ان کے معاصرین کے لئے ایک بہترین تحریک ہے۔ عرفان صدیقی کی شاعری سے متعلق عرفان شناسوں کے لئے یہ کتاب ایک دستاویزی حوالہ ہے۔ جب کبھی عرفان صدیقی کے ناقدوں کی فہرست مرتب کی جائے گی تو اس میں سب سے پہلا نام مرزا شفیق حسین شفق کا لکھا جائے گا۔

شاہد کمال
اکبر پور

کتابیات

"الف"

"ب"

"پ"

پرچھائیاں	ساحر لدھیانوی

"ت"

تلخیاں	ساحر لدھیانوی
تنہائیاں	ساحر لدھیانوی
تیز ہوا اور تنہا پھول	منیر نیازی
تیسری کتاب	محمد علوی

"ج"

جرس	وامق جونپوری
جنگل میں دھنک	منیر نیازی

"چ"

چاک	زیب غوری
چاند نگر	ابن انشاء

"ح"

حاصل سیر جہاں	شہریار
حرف باریاب	افتخار عارف
حرف معتبر	بانی
حساب رنگ	بانی

"خ"

خالی مکان	محمد علوی
خمخانۂ جاوید	لالہ سری رام
خوشبو	پروین شاکر
خواب کا در بند ہے	شہریار
خون شہیداں	ممتاز حسین جونپوری

"د"

دریا	عرفان صدیقی
دست صبا	فیض احمد فیض
دست تہ سنگ	فیض احمد فیض
دشمنوں کے درمیان شام	منیر نیازی
دیوان	ناصر کاظمی

"ر"

رادار	ساقی فاروقی
رخت شب	محسن نقوی
رطب و یابس	ظفر اقبال
روح انیس	مسعود حسن رضوی ادیب
روز رفتہ	مجید امجد
روشنی اے روشنی	شکیب جلالی

"ز"

زرتاب	زیب غوری
زرد زرخیز	زیب غوری
زندان نامہ	فیض احمد فیض
زندگی اے زندگی	خلیل الرحمٰن اعظمی
زوال شب کا منظر	کمار پاشی

"س"

سات سماوات	عرفان صدیقی
ساتواں در	شہریار
سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ	گوپی چند نارنگ

سخن مختصر	معین احسن جذبی
سرخ سویرا	مخدوم محی الدین
سرمایۂ سخن	منظر سلیم
سر وادیٔ سینا	فیض احمد فیض
سیاہ حاشیے میں گلابی رنگ	کشور ناہید

"ش"

شاید	جون ایلیا
شب آہنگ	مہتاب حیدر نقوی
شب درمیاں	عرفان صدیقی
شب رفتہ	مجید امجد
شفق شجر	زیب غوری
شکستوں کی فصل	آشفتہ چنگیزی
شہرِ عدم رفتگاں	انیس اشفاق

"ط"

طلوعِ اشک	محسن نقوی

"ع"

عذابِ دید	محسن نقوی
عشق نامہ	عرفان صدیقی

"غ"

غبار آلودہ سمتوں کا سراغ	ظفر اقبال
غزل	مجروح سلطانپوری

"ف"

فروزاں	معین احسن جذبی

"ک"

کتاب رفتہ	فراست رضوی
کاغذی پیرہن	خلیل الرحمٰن اعظمی
کینوس	عرفان صدیقی

"گ"

گدازِ شب	معین احسن جذبی
گلافتاب	ظفر اقبال
گل تر	مخدوم محی الدین

"ل"

لب گویا	کشور ناہید
لہو پکارتا ہے	علی سردار جعفری

"م"

ماورائے سخن	مہتاب حیدر نقوی
ماہ تمام	پروین شاکر
مجموعہ	احمد مشتاق
معاصر اردو غزل	قمر رئیس
مہر دو نیم	افتخار عارف
میں رونا چاہتا ہوں	فرحت احساس
میں گیا وقت نہیں ہوں	اشفاق حسین

"ن"

نقش فریادی	فیض احمد فیض

"ہ"

ہوائے دشت ماریہ	عرفان صدیقی

●●●

رسائل وجرائد/شخصی انٹرویو

اردو چینل (شمس الرحمٰن فاروقی نمبر)	عبید اعظم اعظمی/قمر صدیقی، ممبئی
انٹرویو/ پروفیسر نیر مسعود	مرزا شفیق حسین شفق، لکھنؤ
انٹرویو/عرفان صدیقی	نیر مسعود/محمد مسعود، لکھنؤ
حدیث دل (عرفان صدیقی نمبر)	محمود نقوی، دہلی
شب خون	شمس الرحمٰن فاروقی، الہ آباد
شعر وحکمت	شہریار/مغنی تبسم، حیدر آباد
کتاب	عابد سہیل، لکھنؤ
نیا دور (عرفان صدیقی نمبر)	ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی، لکھنؤ

اشاریہ

اشخاص

(الف)

(ش)

(غ)

(ف)

(ق)

(ل)

(م)

(ی)

اماکن

(الف)

(ب)

(ن)

نوئیڈا : ۴۲

(ہ)

ہندوستان : ۲۲۔۳۷۔۴۲۔۴۴۔۶۵۔۶۸۔۱۰۵۔۱۴۰۔۱۷۹

(ی)

یمن : ۲۳

●●●